www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ
خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

فروری 2018

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

اردو دنیا

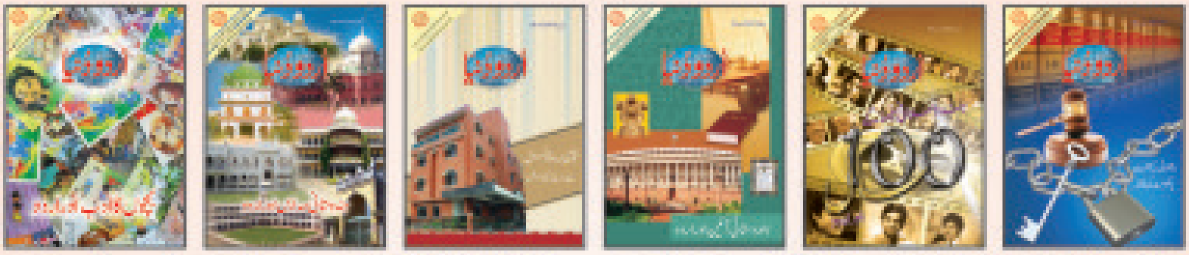

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھئے: اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

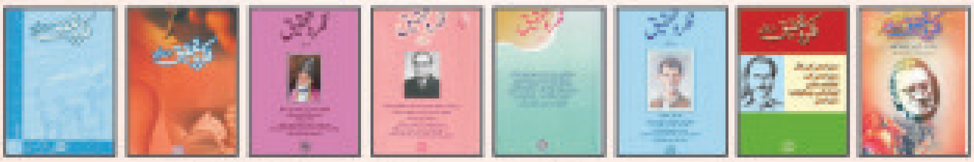

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066 فون: 26109746 فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے | جلد: 2 شمارہ: 2 فروری 2018 | صفحات: Total Pages 64

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

نگارشات ارسال کرنے کے لیے ای میل: kduniya@ncpul.in

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

مشیر: شعیب رضا فاطمی

فہرست

اداریہ

مکالمہ	مدیر	4

روبرو

جیلانی بانو سے محمود ہاشمی کی گفتگو		5

بزم سخن

شاعرات کے منتخب اشعار		10

جہان نسواں

صنفی مساوات کے اولین نقوش	آمنہ تحسین	11
فن خوشنویسی	شاہد حسن	18
ٹریجڈی کوئن مینا کماری	قدسیہ انجم	22

قانون میں خواتین

خواتین کے خلاف خانگی تشدد	خواجہ عبدالمنتقم	24

کہانیاں

جلتے بجھتے دیے	شاہدہ شاہین	28
براج	بنت سید مقبول حسین	31
بے زبان لڑکی	مسرت جہاں	34
تطہیر	ایم اے کنول جعفری	38
یادوں کے سائے	خالدہ ناز	42
پھانس	نصرت شمسی	45
نواب صاحب	پروین طلحہ/صبیحہ انور	47
دو آنکھ	فرحین ناز	50

حسن سخن

مہ جبیں غزال 52، قمر سرور 53، ہاجرہ نور زریاب 54، شہناز فاطمہ صدیقی 54

باورچی خانہ

لذیذ پکوان		55

صحت

معلومات صحت وتندرستی		57

آرائش وزیبائش

چہرے کا حسن نکھارتے		60
تاثرات		62

قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

مقام اشاعت و صدر دفتر: فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025 فون: 49539000

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066 فون: 26109748 فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مکالمہ

الحمد اللہ 'خواتین دنیا' کے ہر تازہ شمارہ کے ساتھ ہم کشاں کشاں اپنی منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ یہ وہ رسالہ ہے جس کے اجرا کا خواب میں نے بہت پہلے دیکھا تھا اور وہ اس لیے کہ معاشرے کی ابتر ہوتی حالت سے میں بے حد رنجیدہ ہو جاتا ہوں میں نے یہ بھی دیکھا کہ مختلف محاذ سے معاشرتی اصلاح کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے جا رہے ہیں وہ بے برگ وبار ہوتے شجر معاشرہ کے پتوں، تنوں اور ڈالیوں پر پانی دینے کے مترادف ہے جبکہ اس کی جڑوں میں دھول اڑ رہی ہے۔ میرا ماننا ہے کہ اس پورے معاشرے کی جڑ خواتین ہیں اور ہم نے اس طبقے کو پوری طرح نظر انداز کر رکھا ہے۔ ایک انسانی جسم کی طرح جس کے تمام اعضا اپنی اپنی جگہ اہم ہوتے ہوئے بھی روح کے بغیر بے معنی ہیں۔ خواتین ہمارے معاشرے کی روح ہیں اور جب تک اس روح کو مناسب مقدار میں آکسیجن کی فراہمی نہیں ہوگی اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ کسی بھی نہج کا اصلاح معاشرہ خواتین کی شمولیت کے بغیر بے معنی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجھے ہمیشہ ایک احساس کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ ہر دور میں نہایت بامعنی تحریریں لکھنے کے باوجود، نہایت پر اثر تقاریر کے باوجود، ہمارا معاشرہ روبہ زوال ہوتا جا رہا ہے۔ جو ترقی ہمیں نظر بھی آ رہی ہے وہ سائنسی ترقی ہے اور وہ بے حس ہوتی ہے۔ ہم اس تکنیکی ترقی کو انسان کی سائنسی ترقی تو کہہ سکتے ہیں، ترقی کا ایک پہلو تو قرار دے سکتے ہیں، مکمل ترقی نہیں کہہ سکتے۔ مکمل ترقی تو اس وقت ہوتی جب معاشرے کا ہر فرد، ہر طبقہ، ہر رنگ ونسل کے لوگ اس کا حصہ ہوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جس وقت اس معاشرے کو رفتار دینے والی گاڑی کے دونوں پہیے باہم مربوط ہو کر غور کریں کہ ہم صرف ایک گھر کے یا خاندان کے ذمہ دار نہیں ہیں ہم جس ملک کے شہری ہیں وہ ملک ہماری ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے، بجلی، پانی، سڑک، پل، آمد ورفت کے وسائل کے ساتھ ہمیں ہر طرح کے تحفظات فراہم کرتا ہے ایسے میں ہماری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں اور ان ذمہ داریوں میں سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرے کو صحت مند بنانے کے لیے ہر وہ کام کریں جس پر ہمارا اختیار ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ماضی میں بھی قلم کاروں نے پوری دنیا میں اصلاح معاشرہ کے لیے تحریکیں کھڑی کی ہیں اور ان تحریکوں کے نہایت مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔ آج بھی اسی طرح کی تحریک کھڑی کرنی ہوگی اور بطور خاص خواتین کو آگے آنا ہوگا ملک ومعاشرے کی ترقی کے لیے صرف حکومت یا اداروں کو ذمہ دار قرار دے دینا یا ان پر تکیہ کر لینا مناسب نہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ملک کا واحد ادارہ ہے جو مسلسل فروغ اردو کے کاز کو آگے بڑھا رہا ہے۔ اس کو قدم قدم پر رہنمائی کی بھی ضرورت رہتی ہے اور مشوروں کی بھی جو ہمیں ملتی بھی ہیں اور ہم ان مشوروں کی روشنی میں عملی اقدام بھی کرتے ہیں۔ 'خواتین دنیا' اسی سلسلہ کا ایک قدم ہے میں چاہتا ہوں کہ اردو معاشرے کی خواتین اپنے ماحول، اپنے مسائل، ترقی کی راہ میں کھڑی ہونے والی دیواریں، نابرابری کے زہر کو مارنے کی سبیل تلاش کریں اور ان کو تحریری شکل دیں تاکہ ملک کے کونے کونے میں بیٹھی آپ کی دوسری ہم خیال بہنیں آپ کی آرا کو نشان منزل بنائیں اور ایک خوشگوار معاشرے کی از سر نو تشکیل ہو۔ اس پلیٹ فارم کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لیے بھی آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ نہایت قلیل عرصے میں اس رسالے نے اپنی ایک شناخت قائم کر لی ہے۔ سب سے زیادہ ضرورت ہمیں مواد کی ہے ایسا مواد جو خواتین کے ذریعہ خواتین کے مسائل، ان کے مزاج ومنہاج کو مدنظر رکھ کر لکھا جائے اور اس سے فکر کے دروازے بھی وا ہوں۔ اس رسالے کی سب سے بڑی معاونت یہ ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں متعارف کرائیں اور ہر شمارے کو تنقیدی نظر سے دیکھ کر ہمیں اپنے تاثرات سے آگاہ کریں تاکہ اگلے شمارے میں ان خامیوں کو دور کر دیا جائے۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

جیلانی بانو سے محمود ہاشمی کی گفتگو

شہرۂ آفاق ناول نگار، کہانی کار اور ترقی پسند ادیب جیلانی بانو اردو کی نامور اور مستند تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی ادب کی سنجیدہ قاری بھی تھیں اور مترجم و نقاد بھی۔ محمود ہاشمی سے بات چیت میں ان کی زندگی، شخصیت اور فن کے بہت سے پہلو ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ یہ انٹرویو آل انڈیا ریڈیو اردو سروس سے نشر ہو چکا ہے جسے شکیل اختر نے اپنی کتاب "روبرو" میں شامل کیا ہے۔ ہم اسے شکیل اختر کے شکریے کے ساتھ خواتین دنیا میں اس لیے شائع کر رہے ہیں تاکہ موجودہ عہد کی خواتین جیلانی بانو کے مزاج و منہاج سے استفادہ کر سکیں۔

محمود ہاشمی: اردو فکشن کی نئی تاریخ میں قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی جیسے ناموں کے بعد جو اہم ترین اور معتبر نام ہمارے سامنے ہے وہ نام جیلانی بانو کا ہے۔ تقریباً تین دہائیوں سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے جیلانی بانو صاحبہ کا فن اپنے آغاز سے آج تک پروان چڑھتا رہا ہے۔ ان کا ابتدائی مجموعہ مجھے یاد ہے کہ پاکستان سے شائع ہوا تھا اور یہ بھی مجھے یاد ہے کہ جس تحریر نے سب سے پہلے اردو فکشن کے قارئین کو بہت چونکایا تھا وہ تھی "جگنو اور ستارے"۔ ایک ناولٹ کے انداز کا طویل افسانہ جس میں اس وقت کے حیدر آباد کی صورتحال اجڑتے ہوئے بنتے ہوئے حیدر آباد کے سلسلے میں اور اس وقت جو نشیب و فراز تھے وہاں کی زندگی میں اس نے بہت متاثر کیا تھا۔ طرز تحریر کے اعتبار سے، کرداروں کے اعتبار سے، کرداروں میں جو Pathos تھا اس کی وجہ سے سب اردو دنیا چونک اٹھی تھی۔ اس کے بعد آپ کے فکشن کی ایک طویل تاریخ ہے جس میں وہ سارے کردار ہیں جو ایک جاگیرداری معاشرے سے نکلنے کے بعد پروان چڑھے۔ بدلتی ہوئی دنیا کو دیکھا، بدلتے ہوئے ہندوستان کو دیکھا، محبت کی نمازیں پڑھیں بھی محض عقیدے کے طور پر کچھ کردار نمازیں پڑھتے رہے۔ ان سب کا تذکرہ جب آپ کی فکشن میں آتا رہا تو ہمیں بہت اچھا لگا۔ آپ کے ناول "ایوان غزل" جس پر آپ کو ایوارڈ بھی ملا۔ آپ کا پاکستان کا وہ سفر اور جو پذیرائی آپ کی وہاں ہوئی سب تفصیل میرے ذہن میں ہے۔ ادب میں آپ کے بارے میں جو کچھ کام ہوتا رہا وہ سب میرے ذہن میں ہے لیکن آپ کا یہاں موجود ہونا بہت سے سوالات کو راہ دے رہا ہے۔

جیلانی بانو: جی۔

محمود ہاشمی: بانو صاحبہ آپ نے جب فکشن کا آغاز کیا اس وقت کا معاشرہ اور آج کا معاشرہ بہت مختلف ہے۔

جیلانی بانو: جی ہاں بہت زیادہ مختلف ہے۔

محمود ہاشمی: عجیب بات یہ ہے کہ Realities کی پابندی چوتھی اور پانچویں دہے کی دنیا اور آج کی دنیا میں بہت سی تبدیلی آچکی ہے۔

جیلانی بانو: بہت بدل چکی ہے۔

محمود ہاشمی: اور ایک طرح سے ہم فکشن کے عہد میں جی رہے ہیں یعنی Space Science نے اور ان تمام تحیر خیز ایجادات نے ہمیں ایک فکشن کی دنیا میں لا کھڑا کیا ہے اور Non-Fiction کا عہد جہاں سے آپ نے شروع کیا تھا وہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا ہے۔ اب لوگ اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ ایٹم کے سلسلے میں آئنسٹائن نے کیا تھا۔ اب Third Force کی بات کرتے ہیں کچھ اور قوت بھی ہے۔

جیلانی بانو: اس کے علاوہ۔

محمود ہاشمی: اس کے علاوہ جس کی وجہ سے کائنات موجود ہے اور وہ قوت فکشن کے بہت قریب ہے تو آپ کیا محسوس کرتی ہیں کہ جس طرح کی فکشن کا آپ نے آغاز کیا۔ اپنے ہم عصروں کے علاوہ آپ سے پہلے جو لوگ تھے اس کے بعد جو فکشن آپ نے شروع کیا، کیا اس کا زوال ہو چکا ہے۔؟

جیلانی بانو: نہیں! محمود صاحب میں یہ نہیں سمجھتی کہ صرف زوال نہیں ہو چکا ہے بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جتنی بھی مذہبی، سیاسی، سماجی، سائنسی اقدار تھیں سب ٹوٹ رہی ہیں اور بڑی بڑی تبدیلیاں بھی آئی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی زندگی میں انقلاب دیکھے ہیں لیکن اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ انسان ان ساری چیزوں سے مایوس ہو رہا ہے۔ سائنس کی ٹکنالوجی سے اور طرح کی جو بھی ہماری اقدار تھیں اور اگر ہم کسی طرف کسی چیز کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں تو وہ صرف آرٹ اور ادب ہے۔ یہ ساری دنیا کے لیے بھی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے برصغیر کے لیے بھی ہے اور

اس کے ساتھ ساتھ میرا یہ بھی خیال ہے کہ آج کل آرٹسٹوں، ادیبوں اور لکھنے والوں پر جتنی ذمہ داری ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ بلکہ دنیا اتنی توجہ طلب کبھی ہم لکھنے والوں کے لیے نہیں تھی جتنی آج ہوگئی ہے۔ خیر آپ تو نقاد ہیں۔ آپ بھی سب دیکھ رہے ہیں، پڑھ رہے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ساری دنیا کے ادب میں لکھنے کا انداز بدل رہا ہے کتنی سوچ کی دھارائیں بدل رہی ہیں۔ زندگی کے بڑے بڑے جو اصول تھے زندگی کے معاشیات کے سب بدل رہے ہیں اور ان سب کا اثر سب سے زیادہ ادب پر پڑ رہا ہے۔ تو ہمارے یہاں بھی ایسی تبدیلی افسانوں میں، شاعری میں اور تنقید میں آئی جسے بعض لوگوں نے پسند نہیں کیا جب کہ بعض لوگوں نے پسند کیا بلکہ یہ بھی ہوا کہ بعض چیزیں اچھی نہیں لکھی گئیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس تجربہ میں کامیاب نہیں رہے ہمارے یہاں جو تبدیلیاں آئی ہیں میں اس سے مایوس نہیں ہوں۔

محمود ہاشمی: 'بارشِ سنگ' حیدرآباد کے معاشرے پر کچھ زیادہ انحصار آپ کا رہا۔

جیلانی بانو: جی ہاں۔

محمود ہاشمی: لیکن ایک خوبی بھی رہی کہ ایک دور میں کچھ نام ایسے ہیں جو حیدرآباد کے معاشرے کے وسیلے سے گلشن میں پہنچائے گئے لیکن بعض اپنی شناخت قائم نہیں رکھ سکے۔ کچھ نام ایسے ہیں عمومی نوعیت کے اس میں ایک بہت ممتاز خاتون ہیں جانی پہچانی ہیں اس کے بعد ان کے پاس شاید وہ موضوعات نہیں رہے اور حیدرآباد کا معاشرہ بالکل بدل گیا یا بالکل نیا ہوگیا۔

جیلانی بانو: لیکن میں نے حیدرآباد کو موضوع اس لیے بنایا کہ میں اس تہذیب میں پلی بڑھی۔ میں نے اپنے آس پاس اس تہذیب کو دیکھا اور میں کہہ سکتی ہوں کہ مجھے وہاں کی تہذیب نے نہیں بلکہ وہاں کے حالات نے مجھے لکھنے پر اکسایا۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہم اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے ہیں جو دیکھ رہے ہیں جو ہمارا ماحول ہے اس کے بارے میں ہم زیادہ اچھی طرح لکھ سکتے ہیں۔ عام طور پر میری زیادہ تر کہانیاں اور ناولوں کا موضوع حیدرآباد اسی لیے ہے کیونکہ میں حیدرآباد کے ادب سے تاریخ سے تہذیب سے ہر چیز سے زیادہ جڑی ہوئی ہوں۔

محمود ہاشمی: عزیز احمد کا آپ نے نام لیا۔ ظاہر ہے ان کے ناول تو ایک زمانے میں بہت مقبول رہے اور اب تک ان کو پڑھا جاتا ہے لیکن جس حیدرآباد کو ہم نے ان کے یہاں دیکھا وہ تو جبلی ہل کا حیدرآباد تھا۔

جیلانی بانو: ہوسکتا ہے جبلی ہل کا حیدرآباد ہو۔ یہ آپ کسی بھی لکھنے والے سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے صرف جبلی ہل کو کیوں Cover کیا۔ آپ نے منا پلی کو کیوں نہیں کیا۔ آپ نے ریڈ ہل کو کیوں نہیں کیا۔ ان کی نظر جہاں تھی ان کا جو مطالعہ تھا، جو وہ جانتے تھے انھوں نے لکھا لیکن آپ یہ دیکھیے کہ انھوں نے اس چیز کو کتنا اچھا لکھا۔ ان کے جو ناول ہیں وہ ناول کی حیثیت سے بھی اچھے ہیں اور ان کی جو اسٹڈی ہے اور جو ان کا مطالعہ ہے میں سمجھتی ہوں کہ عزیز احمد صاحب کے ناول اردو کے بہت اچھے ناولوں میں ہیں۔

محمود ہاشمی: ان کا کام ویسے بھی بہت بڑا ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور فلاسفر بھی۔

جیلانی بانو: مگر میں ان کو سب سے بہتر ناول نگار مانتی ہوں۔

محمود ہاشمی: ناول نگار وہ تو تھے۔ ایک بات یہ بتائیے کہ جب آپ نے لکھنا شروع کیا تو قرۃ العین حیدر اور عصمت کے نام بہت مقبول تھے ان کی کوئی پرچھائیں بھی آپ کی تحریر پر نظر نہیں آئی۔ کیا جان بوجھ کر آپ نے کوشش کی کہ ان کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

جیلانی بانو: نہیں ایسی آپ کو بتاؤں محمود صاحب کہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو اتنا میرا شعور نہیں تھا کہ اتنا میں سوچوں۔ میں نے کوئی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماجی تحریکیں کیا ہیں، ادبی تحریکیں کیا ہیں کون سے ادیب کا کیا کام ہے یہ سب میں نہیں جانتی تھی۔ دراصل میں بچپن میں پینٹنگ کرتی تھی۔ ہم سارے بہن بھائیوں کو پینٹنگ کا بہت شوق تھا، لیکن میرے والد صاحب شاعر تھے اور ادیب تھے اور ان کے ملاقات کا حلقہ بہت وسیع تھا تو ہمارے یہاں شاعر زیادہ آتے تھے اور شاید آپ ان کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارا جو لڑکپن کا دور تھا اس وقت ہمارے لیے جوش صاحب، جگر صاحب، مخدوم صاحب، سردار جعفری صاحب، کیفی اعظمی صاحب یا سجاد ظہیر صاحب یہ سب لوگ ہمارے لیے آج کل کے فلمی ہیرو سے زیادہ اہم تھے۔ وہ بہت بڑی شخصیتیں تھیں اور ہم انھیں ایسا سر اٹھا کر دیکھتے تھے کہ کتنے عظیم آدمی ہیں جنھوں نے یہ چیزیں لکھی ہیں تو ان سب چیزوں کا میرے اوپر اثر رہا اور پھر خاص طور سے کلاسیکل شاعری کو میرے ابا نے ہم لوگوں کو پڑھایا تو روایتی شاعری ہم نے گھر میں پڑھی۔ تھوڑا بہت فارسی اور اردو کے کلاسیکل شاعروں کو پڑھا۔ ان سب کا اثر میرے لکھنے پر آیا تو میں نے یہ سوچ کر کبھی نہیں لکھا کہ میں عصمت کی طرح لکھوں، قرۃ العین حیدر کی طرح لکھوں کرشن چندر کی طرح لکھوں۔ ایسی بات نہ ہو کہ کوئی یہ کہہ دے کہ میں اس کی نقل کر رہی ہوں۔ لیکن میں نے کسی کو نہیں پڑھا تھا جس کا اثر قبول کرتی لکھنے سے پہلے۔

محمود ہاشمی: ان لوگوں سے آپ کی ملاقات تو رہی ہے۔

جیلانی بانو: جی بہت۔

محمود ہاشمی: عصمت آپا سے، عینی آپا سے ان کے بارے میں آپ کا

Reaction کیا تھا۔

جیلانی بانو: دیکھیے! میں آپ کو بتادوں کہ میری دوسری یا تیسری کہانی چھپی تھی تو سجاد ظہیر صاحب ہمارے یہاں ابا سے ملنے آئے تو مجھے پاس بلایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا لکھتی رہو۔ ویسے انھوں نے سلیمان ادیب صاحب کو خط میں بھی لکھا تھا کہ کیوں کہتے ہو کہ حیدر آباد میں لکھنے والے نہیں ہیں۔ جیلانی بانو کی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔ اسی طرح سے میں آپ کو بتاؤں کہ جب 'موم کی مریم' میرا افسانہ چھپا تھا تو اس زمانے کے ایڈیٹر بھی بڑے ظرف والے تھے۔ آج ہم کوئی نئی کہانی کسی رسالے میں دیکھیں تو اس کو پڑھتے بھی نہیں ہیں اور ایڈیٹر بھی اس کو اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن نظیر احمد چودھری نے مجھے وہ سارے Quotations بھیجے تھے جو میری کہانی کے بارے میں لوگوں کے آئے تھے۔ اس میں ظہیر کاشمیری، مختار صدیقی، شکیل بدایونی، خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی کے ریمارکس تھے۔ ان لوگوں نے بڑی اچھی رائے دی تھی۔ شاید وہ خطوط مجھے نہ ملتے تو میں لکھتی بھی نہیں لیکن ان اہم لکھنے والوں نے جب میری طرف توجہ دی تو میرا جی چاہا کہ میں پھر لکھوں تو اس کے تھوڑے دنوں بعد میری شادی ہوگئی اور جب ہم بمبئی گئے تو وہاں کرشن چندر نے ہماری دعوت کی۔ بیدی صاحب نے دعوت کی، بیدی صاحب خود آئے ملنے کے لیے۔ آئے تو اس وقت کے ادیبوں کا اور آج کے ادیبوں کا موازنہ کرتی ہوں تو ہمارے یہاں آج کوئی نیا لکھنے والا آئے تو ہم کب چل کر جائیں گے اس سے ملنے کے لیے لیکن یہ ان کی بڑائی تھی میری بڑائی نہیں تھی۔ وہ کسی ادیب کو عزت دیتے تھے۔ ان کو حوصلہ دیتے تھے اور عینی آپا کا بھی ایک خط آیا تھا۔ انھوں نے خط میں لکھا تھا مجھے کہ تمھارا افسانہ 'جگنو اور ستارے' اچھا لگا اور آئندہ بھی تم لکھتی رہو جس کا ذکر آپ نے کیا تھا۔

محمود ہاشمی: اچھا اس کی وجہ سے آپ کے سارے ابتدائی اچھے افسانے 'موم کی مریم'، 'جگنو اور ستارے' پاکستانی رسائل میں شائع ہوئے۔

جیلانی بانو: ایک دو وجہ تو ہو سکتی ہے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہمارے یہاں یہ سارے رسالے آتے تھے۔ میرے ماموں ریاض فرشوری صاحب علی گڑھ کے تھے۔ ادیب اتنے مشہور نہیں ہوئے لیکن بڑے باذوق تھے اور میرے والد کے پاس آتے تھے۔ تو وہ رسالے گھر میں تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ رسالے کہاں سے نکل رہے ہیں لیکن بعد میں میں نے 'اشارہ' میں اور دوسرے ہندوستان سے نکل رہے پرچوں میں شاید آپ بھی ایک پرچہ نکالتے تھے 'خیال'۔ اس میں، میں نے لکھا ہے تو پھر میں نے ان رسالوں میں بھی لکھا۔

محمود ہاشمی: اصل میں 'موم کی مریم' آپ کے افسانوں کا مجموعہ تھا۔

جیلانی بانو: نہیں۔

محمود ہاشمی: کیا نام تھا اس کا۔

جیلانی بانو: روشنی کا مینار۔

محمود ہاشمی: اور یہ نیا ادارہ نے شائع کیا۔

جیلانی بانو: جی ہاں نیا ادارہ نے شائع کیا تھا۔

محمود ہاشمی: نیا ادارہ لاہور خوبصورت اور معیاری کتابیں چھاپنے کے لیے بہت مقبول تھا اور ہمارے دور کے اچھے شعری مجموعے، ناول، افسانوں کے مجموعے نیا ادارہ نے چھاپے ہیں۔ آپ بعد میں ایک بار پاکستان تشریف لے گئیں۔

جیلانی بانو: کئی بار گئی۔

محمود ہاشمی: پہلی بار آپ گئی تھیں تو کیا صورتحال تھی بتائیے۔

جیلانی بانو: بہت اچھا لگا تھا ہم پہلی بار لاہور گئے تھے۔ وہاں رائٹرس گلڈ میں ہمارا Reception ہوا اور پہلی بار کشور ناہید، طفیل صاحب، احمد ندیم قاسمی صاحب، خدیجہ مستور صاحبہ اور سارے ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ ہم خدیجہ مستور کے یہاں ٹھہرے تھے پھر بعد میں محمد طفیل نے اپنے گھر بلا لیا۔ وزیر آغا صاحب سے ملے اور ان لوگوں نے بہت اچھے جلسے بھی کیے۔ وہاں بھی مجھے بلایا گھروں پر بھی دعوتیں ہوئیں۔ تو ایسا لگا بلکہ یہ احساس ہوا کہ شاید مجھے جاننے والے ہندوستان کی بہ نسبت پاکستان میں زیادہ ہیں۔ ویسے بھی پاکستان والے ہماری کتابیں چھاپتے رہتے ہیں جن کی مجھے اطلاع بھی نہیں ہوتی ہے۔ وہاں اردو کا ماحول ہے۔ اردو پڑھنے والے زیادہ ہیں۔ رسالے زیادہ نکلتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر آپ یہ کہیں کہ میں نے کیوں پاکستانی رسالوں میں لکھا تو میرے خیال میں اس وقت ہندوستان کے سارے اچھے ادیب پاکستانی رسالوں میں زیادہ چھپتے تھے۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی اور بیدی اور ان کی 'ایک چادر میلی سی' سب سے پہلے 'نقوش' میں چھپا۔ بلونت سنگھ کی کہانی 'پہلا پتھر' وہیں چھپی تو زیادہ لکھنے والے وہیں کہ رسالوں میں زیادہ لکھا کرتے تھے۔

محمود ہاشمی: پاکستان میں جو فکشن لکھا جا تا رہا یعنی آپ کے معاصرین میں تو بہت لوگ ہیں اس میں کچھ پرانے لوگ ہیں۔ کچھ آج کے لوگ ہیں۔ نئے لوگوں میں آپ کس کو پسند کرتی ہیں۔

جیلانی بانو: زاہدہ حنا بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ بانو قدسیہ اور اسد محمد خاں ہیں بہت اچھے لکھنے والے ہیں اور پاکستان میں بہت زیادہ لکھنے والے شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی اور مجھے ایسا لگتا ہے وہاں افسانہ اور شاعری ہمارے

ہندوستان کی بہ نسبت وہاں زیادہ اچھی لکھی جارہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں اردو کا ماحول ہے اردو پڑھنے والے ہیں جو اردو میں لکھنا سیکھتے بھی ہیں لکھ سکتے ہیں جب کہ ہمارے یہاں اردو پڑھنے والے لڑکے لڑکیوں کا ماحول ہی ختم ہورہا ہے تو لکھنے والے بھی اسی لیے کم ہوگئے ہیں۔

محمود ہاشمی: اصل میں ایک صورت یہ بھی ہے کہ پاکستان کے بہت سے نئے لکھنے والے آپ نے خود رسائل میں دیکھا ہوگا کہ رشید امجد ہوں، مرحوم احمد محمود ہوں یا کشور ناہید کئی ایک نام لے سکتے ہیں۔ انور سجاد کا نام ہم لے سکتے ہیں۔ یہ سب لوگ وہ ہیں جو ہندوستان سے سند چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں شائع ہونے کے بعد اور قبولیت حاصل کرنے کے بعد ہندوستان سے سند چاہتے ہیں۔

جیلانی بانو: سند چاہتے ہیں تو میں نہیں کہوں گی لیکن یہ حال یہاں کے ادیبوں کا بھی ہے۔ وہاں کے ادیبوں کا بھی۔ جب ہم کسی سے کہیں کہ آپ کی چیز میں نے وہاں پڑھی تو لوگ بہت خوش ہوتے ہیں اور ان کو بہت اچھا لگتا ہے۔ ہمیں بھی اچھا لگتا ہے جب ہماری کتاب ہماری بغیر اجازت کے وہاں چھپ جاتی ہے اور وہ ہمیں لاکر دیتے ہیں اور آپ کے یہاں پڑھنے والے اتنے موجود ہیں۔ تو یقیناً ہمیں اچھا لگتا ہے کہ ہمارے اتنے پڑھنے والے ہیں یا ہماری کہانی پر وہاں بات ہوتی ہے۔ آپ یقین جانیے کہ وہاں کی یونیورسٹی میں میرا استقبالیہ ہوا۔ ایم۔ اے۔ کی لڑکیاں مجھ سے میری کہانیوں پر بات کررہی ہیں جو میرے لیے بڑے تعجب کی بات تھی کہ وہ لڑکیاں جو ابھی پڑھ رہی ہیں وہ مجھے کیا جانیں لیکن وہ جانتی ہیں تو اگر وہ لوگ ایسا کرتے ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ وہ یہاں کے نقادوں کو یہاں کے ادیبوں کو زیادہ صائب رائے سمجھتے ہیں اور اس کو وہ اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی رائے ہمارے لیے زیادہ صحیح اور زیادہ اچھی ہے۔

محمود ہاشمی: آپ کی رائے کیا ہے۔

جیلانی بانو: میرے خیال میں بھی بالکل یہ بات ہے۔ ہمارے یہاں بہت اچھے لکھنے والے ہیں اور بہت اچھی رائے دینے والے نقاد بھی ہیں اور ادیب بھی ہیں اور ایسے لوگ ہیں جن کی رائے کی اہمیت ہے ہمارے لیے بھی اور ان کے لیے بھی۔

محمود ہاشمی: اچھا ایک بات اور بتایئے کہ حیدرآباد کو آپ نے محسوس کیا۔ وراثت میں آپ کو وہ معاشرہ ملا ہے۔ حیدرآباد کی ادبی زندگی میں آپ کے والد کا نام بہت ممتاز رہا ہے۔ آج کے نئے حیدرآباد کو میں نے دیکھا ہے۔ تعمیرات بہترین عمارتیں، بہترین کشادہ سڑکیں، دنیا بالکل بدلی ہوئی۔ وہ معاشرہ بالکل بدلا ہوا جو پہلے تھا اور اردو کا چلن اب بھی وہاں پر ہے۔ مشاعروں میں بے پناہ لوگوں کی حاضری اردو کے اخبارات اور اردو کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا اخبار 'سیاست' وہاں موجود ہے۔ وہاں ذہنی طور پر آپ کیا سمجھتی ہیں کہ لکھنے والوں میں کوئی تبدیلی آئی ہے اس نئے معاشرے کی وجہ سے۔

جیلانی بانو: یہ میرے خیال میں کم آئی ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ حیدرآباد کے لکھنے والے حیدرآباد کے بارے میں بہت کم لکھتے ہیں۔ ویسے ہمارے یہاں اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ابھی ہمارے ایک بہت اچھے افسانہ نگار وہبی صاحب کا انتقال ہوگیا لیکن ابھی بھی جو نوجوان لکھنے والے ہیں بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ آپ مگر ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کیوں نہیں لکھ رہے ہیں۔ شاید ان کو حیدرآباد اتنا توجہ طلب نظر نہیں آتا کہ اس کے بارے میں لکھیں لیکن تیلگو میں اور دوسری زبانوں میں خاص کر تیلگو ادب میں یہ چیز زیادہ نمایاں نظر آرہی ہے کہ بدلتے ہوئے حیدرآباد کو موضوع بنایا جارہا ہے۔ ہمیں زیادہ اچھی کہانیاں اور ناول مل رہے ہیں۔ تیلگو والے ہماری کہانیاں لیتے ہیں وہ یہ کہہ کر لیتے ہیں کہ آپ نے کوئی ایسی چیز لکھی جس میں حیدرآباد نظر آرہا ہے تو ہم اس کا ترجمہ کرلیتے ہیں۔

محمود ہاشمی: کیا آپ کو یہ نہیں محسوس ہوتا کہ حیدرآباد ہو یا دلی پورا ہندوستان اپنے ایک نئے معاشرے کی وجہ سے، نئے setup کی وجہ سے نئے لوگوں کی وجہ سے، نئے مزاج کی وجہ سے ایسا تبدیل ہوا کہ اب ہمیں پرانی وراثتیں کم یاد آتی ہیں۔

جیلانی بانو: بالکل صحیح۔

محمود ہاشمی: یعنی دلی میں آج ہمیں بہادر شاہ ظفر کم یاد آئیں گے پارلیمنٹ زیادہ یاد آئے گی یہاں کا معاشرہ زیادہ یاد آئے گا۔ یہ تبدیلی۔

جیلانی بانو: یہ تو بڑی تبدیلی ہے محمود صاحب آپ سارے معاشرے میں دیکھ رہے ہیں ہر جگہ نظر آرہا بلکہ آج تو میں کہوں گی کہ ہمارے یہاں اب مسجد، مندر، مذہب، سیاست یہ ساری چیزیں ڈائس پر پہنچ گئی ہیں۔ ہم ہر چیز کو Cash کرانے کے فکر میں ہیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم جو لکھ رہے ہیں اس کی قیمت کیا ہے۔ ہم اگر سیاست میں ہیں تو ہم اس کو کس طرح Cash کرائیں گے۔ ادیب ہیں تو کس طرح کیش کرائیں گے۔ ہم اگر مذہبی رہنما ہیں کوئی بھی ہمارا کام ہے تو ہم سب سے پہلے بازار میں اپنی ایک قیمت جانچتے ہیں۔ یہ جو بڑی تبدیلی آئی ہے اس کا اثر ادب پر بھی ہے فن پر بھی بلکہ میں یہ بھی کہوں گی کہ مذہبی جو درسگاہیں ہیں ان پر بھی ہے، سیاست میں بھی ہے۔ یہ کوئی اردو کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ ساری زبانوں کے لیے ہے۔ ادب میں یہ چیز آگئی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے

کہ ہماری زندگی کی جو بھاگ دوڑ ہے ہماری زندگی کی جو قدریں ٹوٹ رہی ہیں تو اس کا اثر ہے کہ ہم ہر چیز جلدی سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اب آپ نے جب لکھا ہم نے لکھا تو ہم لوگوں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ہمارے اس لکھنے کا کوئی مقصد ہے یا کوئی معاوضہ ہے یا اس کا کوئی بدل ہمیں ملنے والا ہے۔ بس ہم لکھتے تھے کہ لکھنا آپ ہر لڑکے لڑکی میں دیکھ لیجیے کہ وہ اگر علم حاصل کر رہا ہے تو اس کے آگے ایک مقصد ہے۔ اگر وہ آرٹسٹ ہے، اگر وہ کوئی سائنٹسٹ ہے، رائٹر ہے چاہے وہ کسی فیلڈ میں ہو اس کا ایک حصہ دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے آس پاس والوں کو دیکھ رہا ہے کہ یہ لوگ کہاں ہیں اور میں کہاں ہوں اور مجھے ان سے آگے نکلنے کے لیے کیا کرنا ہے تو زندگی کے جو رویے بدل گئے ہیں تو اس کا اثر ہر چیز پر پڑ رہا ہے۔

محمود ہاشمی: بدلے ہوئے حالات میں جب آپ لوٹ کر دیکھتی ہیں۔ یعنی 'روشنی کے مینار' سے 'بارشِ سنگ' تک آپ کی جو تحریریں ہیں۔ کچھ تحریریں ایسی بھی ہیں آپ Disown کرنا چاہیں گی رد کرنا چاہیں گی۔

جیلانی بانو: نہیں! میں نے کوئی کہانی فوراً لکھنے کے ساتھ ہی کسی جگہ چھپوا دی اور نہ میں اب تک سوچتی ہوں کہ یہ چیز لکھنا چاہیے تھی تو میری ایسی کوئی تحریر نہیں ہے جس کو دوبارہ پڑھوں اور یہ سوچوں کہ اس کو میں نہیں لکھتی لیکن یہ میں کہہ سکتی ہوں کہ اپنی ہر تحریر کو پڑھنے کے بعد یہ سوچا ہے کہ اب اور کیا لکھنا چاہیے اور میں مطمئن نہیں ہوں اس سے۔ اگر مطمئن ہو جاؤں گی تو شاید ختم کر دوں گی لکھنا۔

محمود ہاشمی: جو چیزیں ہیں آپ کے سامنے اور جو ذخیرہ ہے آپ کا، جس سے آپ کبھی کوئی چیز منتخب کرنا چاہیں اپنی نظر سے تو ناول یا افسانہ میں سے کیا چیز قریب رہے گی۔

جیلانی بانو: نہیں! ایسا مجھ سے کئی بار کہا گیا کہ آپ اپنی بہترین کہانی بتایئے۔ میں نے کہا کہ نہیں میری کوئی کہانی بہترین ہے ہی نہیں اور اسی طرح سے میں تو افسانہ نگار تھی، میں نے ناول کیوں لکھا، کیونکہ جیسا کہ میں 'ایوانِ غزل' کے بارے میں بتاؤں کہ ایک بڑی تہذیب تھی حیدر آباد کی، ایک مخصوص کلچر تھا اس کا جو پس منظر تھا وہ سب کچھ میرے ذہن میں تھا تو اس بارے میں لکھنا شروع کیا تو ناول بن گیا۔ وہ ناول ہے یا نہیں یہ میں نہیں طے کر سکتی۔ جب چھپ گیا اور لوگوں نے اسے ناول مان لیا تو میں نے سوچا کہ شاید یہ ناول ہے۔ تو اس لیے میں نے ناول کے ارادے سے ناول لکھنا بھی شروع نہیں کیا تو ایسے میں سمجھتی ہوں کہ اگر میں نے کوئی اچھی چیز لکھی ہے اور وہ شاید 'ایوانِ غزل' ہوگا۔ اگر ایک مجھ سے کہیں کہ انتخاب کر لیجیے تو۔

محمود ہاشمی: 'جگنو اور ستارے' کے بارے میں کیا کہیں گی آپ۔

جیلانی بانو: 'جگنو اور ستارے' تو میری بہت شروع کی چیز تھی لیکن اس لیے میں اس کو اچھا کہوں گی کیونکہ اس نے لکھنے کا حوصلہ دیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے لکھنا چاہیے۔

محمود ہاشمی: یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی ایسا بڑا واقعہ تہذیبی اعتبار سے، سماجی اعتبار سے جو نئی نسل کو چونکاتا ہو اور گذشتہ نسل کا اور ظاہر ہے آپ نے حیدر آباد کا Fall دیکھا نہیں ہوگا یا دیکھا ہوگا تو اتنی باشعور نہیں ہوں گی۔ اس کے بارے میں لکھنا اور اس میں ایک کرب کی شدت پیدا کرنا۔ کیا لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ بڑے تجربے سے چاہے وہ خود گزرا ہو اس کے بزرگ گزرے ہوں ان کو سنا ہو محسوس کیا ہو ضروری ہے۔

جیلانی بانو: کر سکتا ہے۔ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ اس کرب سے نہ گزرا ہو وہ موضوع بنا سکتا ہے۔ اب میں نے 'ایوانِ غزل' لکھا تو پچاس ساٹھ سال کی تاریخ تھی تو اس کے لیے ریسرچ ورک کی طرح سے کام کرنا پڑا تھا۔ میرا دوسرا ناول ہے اس کے لیے میں جا کر گاؤں میں رہی۔ میں عورتوں سے ملی 'بارشِ سنگ' کے لیے جن لوگوں نے بندھوا مزدور رکھا تو ان Land Lord سے ملی اور جو بندھوا مزدور تھے میں نے ان سے بھی بات کی تو اس کے لیے میں مختلف تجربوں سے گزری پھر اس کے بعد مجھے ایسا لگا کہ ہم جو ان لوگوں کے لیے لکھتے ہیں وہ ہمارا بالکل سطحی مطالعہ ہے ہمارا کچھ مطالعہ نہیں ہے اور ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تو اس کے بعد میں اپنے طور پر کچھ ایسی Voluntary تنظیموں سے متعلق ہو گئی ہوں جہاں گاؤں کی عورتوں سے متعلق کام ہوتا ہے۔ یہ میرا ایک دوسرا کام ہے جس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ادب سے تعلق ہوتا ہے کہ میں زیادہ قریب پہنچ سکی ہوں۔ ان لوگوں کے بارے میں جن لوگوں کے بارے لکھنا چاہتی ہوں۔

محمود ہاشمی: اصل میں بارشِ سنگ کا جو Content ہے اس کے اعتبار سے ناول کا یہ نام جو ہے کچھ شاعرانہ ہے جس کو شاعرانہ تعلّی کہتے ہیں وہ ہے کچھ۔

جیلانی بانو: دیکھیے وہ جو میرا موضوع ہے وہ یہی ہے کہ ایک انسان ہے اس پر کس کی طرف سے پتھر پڑ رہے ہیں۔ وہ صرف ایک معاشی کشمکش میں نہیں ہے۔ اگر وہ کسان ہے تو اس پر ہماری تہذیب، ہمارا مذہب، ہمارے اخلاق یہ ساری چیزیں جو ہیں کس طرح سے سنگسار کر رہی ہیں تو اس طرح سے میں نے اپنے ناول کا نام یہ رکھا ہے۔

محمود ہاشمی: بہرحال ناول بھی آپ لکھتی رہیں اور فکشن بھی اور دوسری چیزیں بھی اور آپ کی تحریریں ہم پڑھتے رہیں۔ آپ کی آمد کا بے حد شکریہ۔

(تاریخ نشر 24 اپریل 1989)

شاعرات کے منتخب اشعار

وہ نہیں میرا مگر اس سے محبت ہے تو ہے
یہ اگر رسم و رواجوں سے بغاوت ہے تو ہے

قرار دے کے مجھے اور بے قرار کیا
یہ آج تم نے مجھے کس طرح سے پیار کیا

دیپتی مشرا

جسے پڑھا نہیں تم نے کبھی محبت سے
کتاب زیست کا وہ باب ہیں مرے آنسو

لوگ نفرت کی فضاؤں میں بھی جی لیتے ہیں
ہم محبت کی ہوا سے بھی ڈرا کرتے ہیں

ثنا حیا

ترا خیال جو تنہائیوں میں رہتا ہے
تو ایک نور سا پرچھائیوں میں رہتا ہے

بچھڑنے والے تجھے یہ خبر نہیں شاید
تو آج بھی مری انگڑائیوں میں رہتا ہے

شبانہ شبنم

کتنا ستم شعار ہے آیا نہ وہ پکار کے
بیٹھی رہی تمام رات زلفوں کو میں سنوار کے

ان کا لفافہ کھلتے ہی خوشبو سے کمرہ بھر گیا
پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے بہار کے

رعنا تبسم

منور ایک ہی جلوہ سے جنگل اور بستی ہے
نگاہ شوق پہ اب تک تزستی کی ترستی ہے

لبالب ہیں جہاں میں ہفت قلزم آب ساقی سے
صدف پھر کس لیے اک بوند پانی کو ترستی ہے

(امیہ بیگم شروانی)

زمانہ بھر کی نگاہوں کی کیوں رہوں مرکز
فسانے اور بھی ہیں میری داستاں کے سوا

وہ ضیا تاب نظارے نہ وہ بھیگی راتیں
چاند افسردہ ہے اب ٹوٹے ہوئے دل کی طرح

(زبیدہ تحسین)

نادان ہیں کچھ وادیٔ ایمن سے ہی مخصوص
دنیا میں ہر اک ارضِ محبت ہے شرر خیز

اس قوم کا آفاق پہ چھا جانا ہے ممکن
سیلاب صفت جس کا ہو ہر پیکرِ نوخیز

(زیب عثمانیہ)

چمن وہی ہے، گھٹائیں وہی، بہار وہی
مگر گلوں میں وہ اب رنگ و بو نہیں باقی

گلے تو ملتے ہیں احباب اے حیا اب بھی
مگر دلوں میں صداقت کی بو نہیں باقی

(حیا لکھنوی)

آمنہ تحسین

صنفی مساوات کے اوّلین نقوش

اردو ناولوں کے حوالے سے ایک جائزہ

ہندوستان میں عرصہ دراز سے مرد اساس معاشرتی نظام چلا آرہا ہے۔اس معاشرتی نظام میں عورت و مرد کے وجود اور ان کے خاندانی وسماجی رول کے متعلق مخصوص روایات، تصورات ونظریات پائے جاتے ہیں۔تاریخی ادوار میں ان مخصوص نظریات کے تحت مردوں کے لیے ''تمام حقوق'' اور خواتین کے لیے ''بے شمار حدود'' کا تعین کیا گیا۔اور ان ہی اصولوں کی بنیاد پر ''صنف'' کی تشکیل کی جاتی رہی۔جس کے نتیجہ میں سماج دومختلف طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔ایک طبقے کو ''صنفِ قوی'' کی حیثیت سے مکمل فوقیت، مرکزیت، حاکمیت، اور فعالیت حاصل ہوگئی جبکہ دوسرے طبقہ کو ''صنفِ نازک'' قرار دے کر تانویت، محکومیت، غیر فعالیت اور حاشیائی حیثیت جہاں ان کے نام کردی گئی وہیں سماج کے دوسرے درجہ کے طبقہ کی حیثیت سے تمام وسائل اور بنیادی حقوق سے انھیں محروم کردیا گیا۔صدیوں سے مروج پدرسری نظریات نے ہندوستانی سماج میں ''صنفی عدم مساوات'' کو بہت فروغ دیا۔جس کے نتیجے میں مرد وعورت کے درمیان، علم وعمل، فکر وشعور، اور سماجی رتبہ کا تضاد بڑھتا چلا گیا۔بلکہ کئی صورتوں میں تمام سماجی ادارے بشمول ادب، عورت ومرد کے درمیان سماجی کردار کے فرق کو بڑھانے نیز مخصوص ''صنفی کرداروں'' کی تشکیل میں معاون کردار ادا کرتے رہے۔

عالمی سطح پر تقریباً سترھویں صدی سے ''صنفی تصورات ونظریات'' پر مباحثے شروع ہوگئے تاہم ہندوستان میں ''صنفی عدم مساوات'' کو ختم کرنے اور ''مساوات'' کو فروغ دینے کی کوششیں انیسویں صدی میں ''اصلاح معاشرہ کی تحریک'' کے پس منظر میں شروع ہوئیں۔وہ ابتدائی کوششیں ''صنفی مساوات'' کی دعویدار نہیں تھیں اور نہ سماجی مصلحین کے پیش نظر کوئی باقاعدہ ''صنفی مساوات'' کا تصور تھا۔بلکہ اصلاح معاشرہ کی غرض وغایت نے انھیں عرصہ دراز سے فراموش شدہ ''طبقہ نسواں'' اور ان سے جڑے مسائل کی طرف متوجہ کیا تھا۔چنانچہ جب اصلاح نسواں کے مقصد سے خواتین کی پست حیثیت پر غور وفکر کی شروعات ہوئی تو سماجی مصلحین کو اندازہ ہوا کہ ہندوستانی سماج میں خواتین کے متعلق سخت عدم مساوات کا رویہ پایا جاتا ہے۔جس کے اثرات خواتین کی حیثیت پر مرتب ہوئے ہیں۔بالخصوص تعلیم سے ان کی دوری اور بنیادی حقوق سے محرومی کے نتیجے میں خواتین خاندانی نظام اور سماجی سطح پر انتہائی پست ترین مقام پر پہنچ گئی ہیں۔لہذا سماج میں ان کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے جہاں سب سے پہلے تعلیمِ نسواں پر توجہ مرکوز کی گئی۔وہیں خواتین کی حیثیت کو متاثر کرنے والے سماجی وصنفی مسائل جیسے بچپن کی شادی، بیوگی کا نظام، ستی کی رسم، کثیر زوجگی نظام یا دیگر سماجی برائیوں کے خاتمے کی طرف بھی توجہ مبذول کی گئی۔بلکہ ان کی روک تھام کے لیے باقاعدہ قانون سازی کے لیے شدید مطالبات بھی کیے گئے۔مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کی کوششوں کے نتیجے میں انیسویں صدی کے اختتام تک اصلاح معاشرہ کی تحریک کے تناظر میں خواتین کی حیثیت کو بہتر بنانے کا رجحان دھیرے دھیرے بڑھنے لگا اور اسی پس منظر میں کسی حد تک ''صنفی مساوات'' کا تصور بھی عام ہونے لگا۔

بیسویں صدی میں سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی افراد کی ذہنی وفکری تبدیلی کی رفتار تیز تر ہونے لگی۔خواتین کی تعلیم وترقی کے رجحانات بھی فروغ پانے لگے۔ترقی کے ذرائعوں تک ان کی پیش رفت ہونے لگی۔ملک کی آزادی کے بعد دستورِ ہند کے دفعات میں مردوں کے برابر خواتین کو بھی مساویانہ مراعات دیے گئے اور ان کے حقوق کے تحفظ اور صنف کی بنیاد پر تشدد کی روک تھام کے لیے کئی ایک قوانین بنائے گئے۔

نیز ان کی تعلیم و ترقی اور بااختیاری کے ضامن پروگرامس کو پنج سالہ منصوبوں میں شامل کیا گیا اور ان پر عمل آوری کے لیے لائحہ عمل تیار کیے گئے۔ اس درمیان کئی ایک انجمنوں و اداروں کا قیام بھی عمل میں آتا رہا۔ ان انجمنوں نے بالخصوص ''صنفی مساوات'' کے نظریات کو عام کرنے میں کلیدی رول ادا کیا۔ یہ تمام کاوشیں، سماجی عدم مساوات سے متاثرہ ہندوستانی خواتین کی مسخ شدہ شبیہ کو کچھ حد تک بدلنے میں یقیناً مددگار ثابت ہوئیں۔ سماجی سطح پر ''صنفی مساوات'' کے نظریات کو فروغ دینے کی جدوجہد میں خواتین کی بھی بھرپور اور اہم حصہ داری رہی ہے۔ انیسویں صدی کے آخری دہائیوں سے ہی باشعور خواتین نے صدیوں سے مروجہ ''صنف پر مبنی مخصوص تصورات'' کے خدوخال کی ورنگی کے ساتھ ساتھ سماج میں طبقۂ نسواں کے بہتر مقام اور حقوق کے حصول کی جدوجہد کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا نیز خواتین کے ''روایتی کردار'' کو بدلنے کی کامیاب مساعی کر نے لگی تھیں۔ جس کے نتائج بعد کے برسوں میں ظاہر ہونے لگے۔

ہندوستانی معاشرہ میں ''صنفی مساوات'' کے رجحان کو عام کرنے میں اردو کے جدید ادب کا کافی اہم رول رہا ہے۔ دراصل 1857 کے فوری بعد سے لکھے گئے ادب کی بنیاد بالواسطہ طریقے سے ''صنفی مساوات کے تصورات'' پر رکھی گئی۔ ابتداء میں ''صنفی مساوات کا تصور'' اگرچہ کہ نہایت محدود تھا۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ ایک پیچیدہ اور قدامت پسند مرد اساس معاشرہ میں ''صنفی مساوات'' کے تصورات کو پیش کرنے کی وہی اولین کوششیں دراصل بنیاد کا کام کر گئیں۔ بعد کے برسوں میں جس پر باقاعدہ عمارت تعمیر کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

''صنفی مساوات'' کے نقطۂ نظر سے اردو ادب کا جائزہ لیں تو مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، پنڈت رتن ناتھ سرشار، محمد حسین آزاد، رسوا وغیرہ کے نام اولین مصنفین کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ مذکورہ مصنفین نے ادب میں خواتین کے ماضی سے چلے آرہے روایتی ''اسٹیریو ٹائپ'' کرداروں سے ہٹ کر'' مختلف سماجی مسائل میں گھری ''صنفی عدم مساوات'' سے متاثرہ خواتین کے کردار پیش کر نے کی کوشش کی اور ان کے مسائل، بالخصوص ان کی تعلیم و تربیت کی اہمیت و افادیت کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا اور اپنے مشاہدات کی بنیاد پر ہندوستانی سماج کے تناظر میں ان کے بہتر مقام و مرتبہ کے متعلق مختلف نظریات پیش کیے۔ تاہم ان کے نظریات میں بڑی حد تک ذہنی تحفظات کے ساتھ ساتھ اصلاحی جذبہ غالب رہا۔ جس کے پس پردہ'' مکمل مساوات'' کے بجائے ایک ''مثالی عورت'' کے تصور کی تشکیل ہوتی رہی۔

کم و بیش اسی دور میں یعنی انیسویں صدی کی آخری دہائیوں سے چند ایک خواتین بھی اپنی تخلیقات و تحریروں کے ساتھ منظر عام پر آنے لگیں۔ ان کی تحریروں میں اس دور کے غالب رجحانات و موضوعات کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ خواتین نے بھی تعلیمی و سماجی مسائل کو بنیاد بنا کر ادب تخلیق کیا۔ تاہم اس پس منظر میں کچھ اہم نکات بھی اٹھائے جا سکتے ہیں کہ کیا ''صنفی مسائل'' کی پیش کشی میں خواتین کا رویہ بھی مرد ادیبوں کی طرح کا تھا یا ان کی پیش کشی میں کہیں کوئی فرق پایا جاتا ہے؟ خواتین نے اپنی تحریروں کے ذریعہ کس طرح کے'' صنفی امتیازات'' کی نشاندہی کی؟ اور '' صنفی مساوات'' کے متعلق ان کے کیا تصورات رہے تھے؟ اس تجزیے کے لیے ناول بے حد اہم ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ ناول چونکہ معاشرتی زندگی کے عکاس ہوتے ہیں۔ لہذا، جدید ادب کے ابتدائی دور میں خواتین کی جانب سے تحریر کردہ ناولوں کے تجزیے سے ''صنفی مساوات'' کے اولین تصورات کو بخوبی جانچا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس مطالعہ کے لیے ابتدائی دور کے چند خواتین کے ناولوں کا انتخاب کیا گیا۔

رشید النساء کے ناول'' اصلاح النساء'' کو خاتون کا لکھا پہلا اردو ناول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ رشید النساء ضلع پٹنہ سے تعلق رکھنے والی خاتون تھیں۔ انھوں نے یہ ناول 1881 میں لکھا۔ لیکن اسے شائع نہیں کر سکیں۔ تیرہ برسوں بعد یعنی 1894 میں ان کے صاحبزادے محمد سلیمان نے اسے شائع کروایا۔ اس کتاب پر مصنفہ کے نام کے بجائے'' والدہ محمد سلیمان سلمہ الرحمن (بیرسٹرایٹ لا) لکھا ہے۔ اس ناول کی اشاعت میں تاخیر کے متعلق خود رشید النساء کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

> '' کتاب تو چھ مہینے میں تیار ہوگئی مگر چند وجہیں ایسی ہوئیں کہ چھپ نہ سکی۔۔۔۔ محمد سلیمان سلمہ الرحمن کے عمدہ تعلیم پانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ تیرہ برس سے یہ کتاب جو رڈی میں پڑی تھی اس کو انھوں نے چھپوا دیا۔''

(اصلاح النساء، ص 11)

درج بالا مذکور حقائق سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی سماج میں ''صنفی امتیاز'' کی صورتحال کیا تھی۔ مرد حضرات تخلیقی اظہار کی آزادی اور حق رکھتے تھے لیکن خواتین کو لکھنے پڑھنے یا اپنی تحریروں کو منظر عام پر لانے بلکہ اپنی شناخت کے ساتھ تخلیقات پیش کرنے کی بڑے عرصہ تک اجازت نہیں تھی۔ سماجی تحدیدات اور ذہنی تحفظات کے اس ماحول میں رشید النساء کا ناول نگاری کی طرف توجہ دینا اور اصلاح خواتین کے مقصد سے کتاب تحریر کرنا ایک جرات مندانہ قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ناول کے

مطالعہ سے ''صنفی مساوات'' کے متعلق رشید النساء کے خیالات کی بہترین عکاسی ہوتی ہے۔ ناول ''اصلاح النساء'' میں انھوں نے جہاں سماج کی جانب سے خواتین کے ساتھ روا رکھے گئے عدم مساوات کے رویّوں کی نشاندہی کی ہے وہیں ان کے لیے مساویانہ مواقعوں اور بنیادی حقوق کے اہم پہلوؤں کی طرف توجہ بھی دلائی ہے۔ مثلاً عرصہ دراز تک سماج میں یہی تصور تھا کہ خواتین کے مسائل پر لکھنا یا ان کی اصلاح صرف مردوں کی ذمہ داری ہے۔ خواتین کو علم وعمل سے دور رکھ کر یہ طے کر لیا گیا تھا کہ وہ اس فریضہ کو انجام نہیں دے سکتیں۔ جبکہ رشید النساء نے اس ناول کے ذریعہ اس روایتی تصور کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے وضاحت کر دی کہ مسائل نسواں کے متعلق مردوں کی لکھی تحریروں میں صرف ان کے مشاہدات حصہ بنیں گے جبکہ خواتین کے تجربات، احساسات وجذبات ان موضوعات کی حقیقت کو بہتر طریقے سے واضح کر پائیں گے۔ رشید النساء کا اس اہم فرق کی وضاحت کرنا گویا اس اجارہ داری نظام کو بدلنے کی کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔ جس میں مرد ''پروائڈر'' اور عورت کو ہمیشہ ''رسیور'' کے دائرہ میں رکھ کر یہ بتایا جاتا رہا ہے کہ کب، کیا اور کیسے کرنا ہے۔ جبکہ رشید النساء نے ناول میں یہ نظریہ بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ خواتین کی ذہن سازی کے لیے صرف مردوں کی کاوشیں فائدہ بخش نہیں ثابت ہوں گی بلکہ اس ضمن میں خواتین کی تحریریں اہم ہوں گی۔ جیسا کہ وہ لکھتی ہیں۔

''اللہ مولوی نذیر احمد کو عاقبت میں بھی بڑا انعام دے۔ ان کی کتاب کے پڑھنے سے عورتوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ جہاں تک ان کو معلوم تھا انھوں نے لکھا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن میرے لکھنے میں عمدہ بات یہ ہوگی کہ اس کتاب کے پڑھنے سے عورتوں پر اثر زیادہ ہوگا اور سمجھیں گی کہ اس نے عورتوں کی رسموں کو جہاں تک لکھا ہے آنکھوں دیکھی بات لکھی ہے۔''

(اصلاح النساء، ص 162)

زیر بحث ناول کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رشید النساء ایک روشن خیال اور باشعور خاتون تھیں۔ وہ نہ صرف سماج میں خواتین کی پست حیثیت کا ادراک رکھتی تھیں بلکہ ان کی حالت کو بدلنے کے لیے مکمل لائحہ عمل کا تصور بھی رکھتی تھیں۔ اگرچہ اس دور میں تعلیم نسواں کی شروعات کے لیے مختلف کوششیں کی جا رہی تھیں لیکن تعلیم نسواں کا تصور یا تو محدود شکل میں تھا یا پھر اس کی مخالفت بھی کی جا رہی تھی۔ جیسا کہ جدید تعلیم کے بانی سر سید احمد خاں نے 1875 میں لڑکوں کے لیے علی گڑھ میں اسکول قائم کیا تھا جبکہ تعلیم نسواں کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ

''میری دلی آرزو ہے کہ عورت کو بھی عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی جائے۔ مگر موجودہ حالت میں کنواری عورت کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا ہے۔ اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے۔ عورت کی تعلیم قبل مہذب ہونے مردوں کے، نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لیے آفت درماں ہے۔۔۔ جب مرد پہلے تعلیم حاصل کر لیں گے تو وہ خواتین کی تعلیم کا نظم کر لیں گے''

(خط بنام مولوی ممتاز علی۔ بحوالہ ''سرسید اور ان کا عہد'' از۔ ثریا حسین۔ ص 356)

سر سید کے نظریہ تعلیم نسواں کے بالکل برعکس رشید النساء کا نظریہ ملاحظہ کیجیے جو دو کرداروں کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔

''اشرف النساء۔ لڑکیوں کی بے تعلیمی کے سبب سے لڑکے بھی پوری تعلیم پا نہیں سکتے۔۔۔۔۔۔ جب لڑکیاں شائستہ اور تعلیم یافتہ ہو جائیں گی تو لڑکوں کا تعلیم پانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

شہزادی۔ لڑکیوں کی تعلیم پانے سے لڑکے کیوں کر تعلیم پائیں گے؟

اشرف النساء۔ مرد کی تعلیم عورتوں کے اختیار میں ہے۔ جب لڑکے پیدا ہوتے ہیں تو پہلے ماں ہی سے تعلیم پاتے ہیں۔ بعد اس کے مولوی ماسٹر کے سپرد ہوتے ہیں۔ اس لیے مادری تعلیم کا اثر دل سے جاتا نہیں ہے'' (اصلاح النساء، ص۔ 162-161)

رشید النساء نے اس ناول کے ذریعہ جدید تعلیم کا نظریہ پیش کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی اسکول کی باقاعدہ تعلیم اور ان کی تربیت کو ضروری قرار دیا۔ لڑکیوں کے لیے نہ صرف انگریزی تعلیم کی حمایت کی بلکہ اسکول کے باقاعدہ قیام کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنایا۔ جیسا کہ وہ ایک کردار لاڈلی کے سوال کا جواب میں کہتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے

''لاڈلی۔ اب کوئی وہاں اسکول بھی بنے گا۔ لڑکیاں انگریزی بھی پڑھیں گی

اشرف النساء۔ کوئی علم ہو اس کے حاصل کرنے میں برائی نہیں ہے۔۔۔۔۔ فقط لکھنا پڑھنا یہ تو لڑکیوں کے حق میں بہتر نہیں ہے بلکہ اچھی بات بھی تو سیکھنا چاہیے''

(اصلاح النساء، ص۔ 159-160)

رشید النساء نے لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم نیز پیشہ وارانہ تعلیم کی ضرورت

واہمیت کا بھی احساس دلایا۔ ناول کے کردار شہزادی اور اشرف النساء کے درمیان گفتگو سے رشیدالنساء کے ''صنفی مساوات'' کے ترقی یافتہ تصور کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے

> ''شہزادی۔ یہ عورت ذات ہو کر طبابت کی کتابیں کیوں کر پڑھیں؟
>
> اشرف النساء۔ یہ کیوں؟ کیا عورت طب پڑھ نہیں سکتی ہے؟ کون سا کام ہے جو عورت نہیں کر سکتی ہے، آنکھ، کان، سمجھ بوجھ تو عورت کو بھی اللہ نے دی ہے۔ مگر یہاں تو لڑکیوں کو چھوڑ دیتے ہیں کہ نہ پڑھیں لکھیں، نہ ہنر سیکھیں، گڑیا کھیلنے میں اپنے دن گنوائیں۔ مرد کی تعلیم ہوتی ہے تو ان کا جو ہر کھلتا ہے کہ یہ ہوئے وہ ہوئے۔ عورت کی تعلیم ہی نہیں ہوتی ہے۔ جس سے گھر کی سب طرح کی درستگی ہو دین دنیا کی بھلائی ہو'' (اصلاح النساء، ص163)

رشیدالنساء نے تعلیم کے حصول میں مساوات کے ساتھ ساتھ لڑکے اور لڑکی کی پیدائش کے متعلق ذہنی تحفظات کو بدلنے کی اس طرح سے کوشش کی کہ دونوں کی پیدائش پر یکساں خوشیوں بھرے مناظر پیش کیے گویا سماج میں مروج عدم مساوات کے ایک اہم مسئلہ کو زیر بحث لایا۔ علاوہ ازیں رشیدالنساء نے سماج کے تشکیل شدہ ایک اہم روایتی ''صنفی کردار'' کو بھی تبدیل شدہ شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ جیسے ناول کا کردار میر نادر علی کم تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ ان کی شادی ایک ایسی تعلیم یافتہ لڑکی سے ہوتی ہے جو طب کی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق رکھتی ہے۔ اپنی بیگم کے ذوق کتب بینی سے متاثر ہو کر میر نادر علی بھی طب کی کتابیں پڑھنے لگتے ہیں اور تھوڑے عرصے میں ایک بہترین طبیب بن کر خدمات انجام دینے لگتے ہیں۔ اس طرح سے رشیدالنساء نے روایتی صنفی کردار کو ایک نئے نظریے کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لایا اور بتایا کہ خواتین کو جو سماجی رول دیے گئے ہیں وہ فطری نہیں ہیں بلکہ انھیں سماج نے تشکیل دیے ہیں۔ جو تبدیل بھی کیے جا سکتے ہیں اور ہر سطح پر انھیں مساویانہ مواقع دیے جا سکتے ہیں۔

صنفی مساوات کی اولین علمبردار خواتین میں شہر حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی خاتون صغراء ہمایوں مرزا کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ صغراء ہمایوں مرزا نے ناول لکھے، کہانیوں کے علاوہ بہترین مضامین بھی تحریر کیے۔ ان کی شاعری کا ایک مختصر مجموعہ بھی منظر عام پر آیا۔ ان کی تحریروں میں بالخصوص ناولوں میں ''صنفی مساوات'' کے تصورات کے بڑے واضح نقوش ملتے ہیں۔ صغراء ہمایوں مرزا نے اپنی تمام تر زندگی خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے وقف کر دی تھی۔ بیسویں صدی کی اولین دہائی سے ہی ان کے علمی، ادبی اور سماجی خدمات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے رسالہ ''النساء'' کی اشاعت کے ساتھ اپنی صحافتی خدمات بھی شروع کیں۔ نیز اپنی ادارت میں رسالہ ''زیب النساء'' بھی کئی عرصہ تک شائع کرتی رہیں۔ گویا خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے انھوں نے دامے، درمے، سخنے، ہر طرح سے اپنی خدمات پیش کیں۔ انھیں بیشتر موقعوں پر سماج میں موجود ''صنفی عدم مساوات'' کے نظریات سے واسطہ پڑتا رہا۔ ان نظریات کی تبدیلی کے لیے انھوں نے اپنی تحریروں کا سہارا لیا۔ ان کے ناولوں میں جہاں خواتین کے مسائل اور ان کی ثانوی حیثیت زیر بحث آئی ہے وہیں ان کی ترقی و شعور بیداری کے لیے ''صنفی مساوات'' کی ضرورت واہمیت کے کئی پہلو بھی اجاگر ہوئے ہیں۔ جن کی جانب صغراء ہمایوں مرزا نے سماج کی توجہ مبذول کروائی ہے جیسا کہ ۱۹۰۶ء میں شائع ناول ''مشیر نسواں'' میں وہ خواتین کو سماج میں دوسرا درجہ دینے کی وجوہات پر بڑا اہم سوال اٹھاتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے

> ''انسان کا فرقہ مرد و عورت سے بنا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مرد تو دنیا میں ایسے بڑے بڑے کام کرتے ہیں، ملک فتح کرتے ہیں، کتابیں لکھتے ہیں، دنیا کی سیاحت کرتے ہیں، بادشاہت کرتے ہیں۔ لیکن عورتیں پنجرے میں بند رہتی ہیں۔۔۔۔ اگر مرد کفالت نہ کریں تو بھوکی مر جائیں۔۔۔۔ ہندوستان کی عورتوں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ وہ ایسی خراب حالت میں رکھی جاتی ہیں۔''

(مشیر نسواں، اشاعت 1906ء ص162)

صغراء ہمایوں مرزا نے بھی صنفی عدم مساوات کے تصور کو ختم کرنے کے لیے تعلیم نسواں کی اہمیت پر زور دیا اور عملی طور پر بھی تعلیم کے فروغ کے لیے خدمات انجام دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ صغراء ہمایوں مرزا کے ہاں ''صنفی مساوات'' کا تصور صرف مردوں کے برابر تعلیم کے حصول تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ معاشی میدان میں بھی وہ خواتین کی حصہ داری کی طرف سماج کی توجہ مبذول کرواتی ہیں۔ انھیں اس بات کا پوری طرح سے احساس تھا کہ تعلیم و ترقی نسواں کے نام پر جو اقدامات ہندوستان میں اپنائے جا رہے ہیں ان میں بھی ''عدم مساوات'' کے نظریے غالب ہیں۔ جس کی وجہ سے ان اقدامات کے کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے ہیں۔ اس اہم نکتہ کو انھوں نے ''ناول مشیر نسواں'' میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

ناول کا ایک منظر ملاحظہ کیجیے۔ کسی موقع پر دلی شہر میں ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوتی ہے۔ اس کانفرنس کی اطلاع پا کر ناول کی ہیروئن زہرہ اپنا

کافی طویل خطبہ (لیکچر) تیار کر کے بھجواتی ہے۔اس خطبہ کی کانفرنس میں پیش کشی عمل میں آتی ہے۔اس خطبہ میں زہرہ خواتین سے جڑے کئی ایک اہم مسائل کی طرف توجہ دلاتی ہے اور ان کے حل کے لیے تجاویز بھی پیش کرتی ہے۔تعلیم کی ترقی کے مشن میں خواتین کو شامل نہ کرنے کے رویوں پر تنقید کرتے ہوئے اس کے نقصانات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس لیکچر کا ایک اقتباس دیکھیے

''جب کبھی مجھے کانفرنس کی رپورٹ پڑھنے کا اتفاق ہوا تو میں نے اس میں کسی خاتون کا کوئی مضمون نہیں دیکھا اور نہ کوئی رزولیشن ایسا پڑھا جو تعلیم نسواں کی ترقی اور تہذیب کے متعلق پاس کیا گیا ہو۔اس سے مجھے خیال ہوا کہ شائد ممبران کانفرنس نے فرقہ اناس کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر الگ پھینک دیا ہے۔اور یہ لوگ قوم کی گاڑی کو ایک ہی پہیہ سے چلانا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔آپ حضرات انسانوں کے صرف ایک ہی فرقہ کی تعلیمی ترقی کی فکر نہ کریں بلکہ دونوں کی ترقی کی فکر کریں،اور اصلی ترقی جب ہی ہوگی جب عورتیں تعلیم یافتہ وروشن خیال ہوں گی۔''

(مشیر نسواں،ص179۔178)

صغراء ہمایوں مرزا کی تحریروں میں ''صنفی مساوات کے تصور'' کی ارتقائی صورت بھی نظر آتی ہے۔ان کا پہلا ناول ''مشیرِ نسواں'' 1906 میں منظرِ عام پر آیا تھا اس وقت تک خواتین کے لیے ''مساویانہ حقوق و مواقعوں'' کا تصور تعلیم اور گھریلو نظام میں ان کی بہتر حیثیت تک محدود تھا تاہم بدلتے وقت کے ساتھ صغراء ہمایوں مرزا کی فکر میں مزید وسعت ہوتی گئی۔انھوں نے اپنے جدید نظریات کو ناول ''سرگذشتِ ہاجرہ'' میں بھر پور انداز میں پیش کیا۔یہ ناول 1926 میں منظرِ عام پر آیا۔اس ناول میں صغراء ہمایوں مرزا نے خواتین کی ترقی کے لیے ''صنفی مساوات'' کی ضرورت اور اہمیت کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور خواتین کے کردار کو صرف گھر کی چار دیواری تک محدود کرنے کے بجائے قومی سطح پر فعال بننے کا تصور بھی دیا۔بلکہ یہ نظریہ بھی پیش کیا کہ خواتین کی مساویانہ شرکت کے باعث ہی مردوں کی ترقی ممکن ہوگی اور ملک کی آزادی بھی۔اس ناول میں صغراء ہمایوں مرزا،طبقہ نسواں کی ترقی کے لیے مردوں کی ہمدردی اور تعاون کی طلب سے اپنی توجہ ہٹا کر خواتین کی شعور بیداری اور ان کی فعالیت پر مرکوز کرتی ہیں۔گویا ''صنفی مساوات'' کے حصول کے لیے خود خواتین کو ذمہ دار بتاتی ہیں اور اپنی کوششوں سے سماج میں اپنا مقام و مرتبہ بنانے کے لیے انھیں بیدار کرتی ہیں۔لکھتی ہیں

''میرے خیال میں جب تک ہم خود تعلیم وتربیت حاصل نہیں کر چکے اور مثل مردوں کے ہم عورتوں کو آزادی نہ ملے گی اس وقت تک ملک ترقی نہیں کر سکتا اور ہوم رول بھی نہیں مل سکتا۔ہم کو چاہیے کہ ہم خود گاندھی جی بن جائیں اپنی اپنی جگہ ہم آزادی سے کام کریں،ہم کو تو قید میں رکھا گیا ہے۔ایک ہاتھ سے کوئی کشتی لڑ سکتا ہے،یہ ممکن نہیں یہ مردوں کا غلط خیال ہے کہ عورتیں ناقص العقل ہیں۔عورت کے سبب سے مردوں کی ترقی ہے۔''

(سرگذشتِ ہاجرہ،اشاعت 1926 ،ص۔19)

درجِ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صغراء ہمایوں مرزا کی نظر میں خواتین کی تعلیم وترقی،آزادی اور قومی سطح پر مردوں کے برابر حصہ داری ضروری و ناگزیر ہے۔تاہم ہندوستانی سماج میں خواتین کے متعلق فرسودہ تصورات ونظریات کی موجودگی ان کی مساویانہ حصہ داری کے درمیان حائل ہے۔لہٰذا ان تصورات ونظریات کو ختم کرنے کے لیے وہ اپنی ناول ''سرگذشتِ ہاجرہ'' میں خواتین کی تحریکات کی ضرورت پر زور دیتی ہیں اور انھیں حکومتی سطح پر مساویانہ حقوق ومواقعوں کے مطالبات رکھنے کی تجویز بھی پیش کرتی ہیں۔تاہم عدم مساوات کے سماجی رویوں کے پیش نظر اس تحریک کی کامیابی کے متعلق خدشات کا اظہار بھی کر جاتی ہیں۔جیسے زیرِ بحث ناول کا ایک کردار ''ہاجرہ'' جب بیوگی کے نظام کو ختم کرنے اور بیواؤں کے نکاحِ ثانی کے لیے ''آل انڈیا ودو کانفرنس'' کے قیام کی تجویز رکھتی ہے تو اس ناول کا دوسرا کردار ''سارا'' اس ضمن میں مرد اساس معاشرہ کے عدم تعاون سے اس کام کے مکمل نہ ہونے کے خدشات کا اظہار کرتی ہے۔یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے

''یہ خیال تو بہت اچھا ہے،مگر سوال یہ ہے کہ یہ کام مرد کریں یا ہم عورتیں کریں؟ خدا اس تحریک کی تائید خود کرے تو شائد یہ کام پورا ہو ورنہ ہمارے فرقہ کے لیے کون کوشش کرتا ہے،مرد تو یہ نہیں چاہتے کہ ہم ان کے دوش بدوش کام کریں یا تعلیم حاصل کریں۔''

(سرگذشتِ ہاجرہ،ص۔78)

صغرا ہمایوں مرزا نے اپنی تحریروں میں صنفی مساوات کے تصور کو عام کرنے کے لیے کئی ایک مسائل کو زیرِ بحث لایا تاکہ سماج کی ذہن سازی کی جا سکے۔جن میں لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان امتیازات کے خاتمہ کی کوشش،شادی میں لڑکی کی پسند اور رضامندی کی اہمیت،لڑکوں کے برابر تعلیم کے حصول کی وکالت،مختلف ہنر سیکھنے پر زور،ہوم رول تحریک یا آزادی کی تحریک کا حصہ بننے پر زور،کثیر زوجگی نظام کی مذمت اور بیوگی کے

نظام کا خاتمہ، بیوہ کے نکاح ثانی کی تائید وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ صغرا ہمایوں مرزا نے جہاں صنفی امتیازات کی نشاندہی کی وہیں ان کے خاتمہ کی طرف بھی بھر پور توجہ دلائی۔ نیز خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے مساویانہ مواقعوں اور حقوق کے حصول کے لیے نہ صرف مردوں کو ذمہ دار ٹھہرایا بلکہ خواتین میں بھی شعور بیدار کرنے کی بھر پور کوشش کی۔

رشید النساء اور صغرا ہمایوں مرزا کے علاوہ ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین میں نذر سجاد حیدر ایک اہم نام ہے۔ نذر سجاد حیدر کے ناولوں میں اس دور کی ناول نگار خواتین کے برعکس ''صنفی مساوات کے تصورات'' زیادہ واضح اور ترقی یافتہ شکل میں نظر آتے ہیں۔ نذر سجاد حیدر کا تعلق علی گڑھ سے تھا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اپنے شوہر سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ، تعلیمی، سماجی اور بیداری نسواں کے لیے وقف کر دی تھی۔ بالخصوص سماج سے ''صنفی عدم مساوات'' کو ختم کرنا اور حقوق نسواں کی تحریک کو فروغ دینا ان کا مقصدِ اولین تھا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے اپنی تحریروں کو ذریعہ بنایا۔ انھوں نے ناول، افسانے اور مضامین میں طبع آزمائی کی۔ وہ روزنامچہ بھی لکھا کرتی تھیں۔ اس روزنامچہ کے حوالے سے ان کی صاحبزادی قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں

> ''اماں کے روزنامچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحریک آزادی نسواں کی وہ ایک پیش رو رہیں اور سرگرمی سے اس میں حصہ لیا۔ لیکن انھوں نے اسٹیج پر جا کر کبھی تقریریں نہیں کی۔ البتہ اپنے قلم کے ذریعے خوب خوب جد و جہد کی۔ آزادیٔ نسواں اور آزادیٔ ہند کے لیے سرگرم رہیں۔''

(ہوائے چمن میں خیمۂ گل، ص۔ 51)

نذر سجاد حیدر کا پہلا ناول '' اختر النساء'' رسالہ ''تہذیب نسواں'' میں 1908 سے قسط وار شائع ہوتا رہا اور 1911 میں کتابی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ نذر سجاد حیدر نے جملہ سات ناول لکھے۔ ان کے ناولوں میں صنفی مساوات کی جد و جہد یا عدم مساوات پر نوحہ گری کا تصور نہیں ملتا بلکہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ایسے خاندان اور معاشرتی ماحول کو پیش کیا جسے ''صنفی مساوات کا ماڈل'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے ناولوں کے نسوانی کردار تعلیم یافتہ، باشعور، باہمت اور جدید ماحول کے پروردہ ہیں۔ وہ اپنا ایک آزاد اور مکمل ''وجود'' رکھتے ہیں۔ نذر سجاد حیدر نے انھیں تمام بنیادی حقوق کے ساتھ ایک بھر پور زندگی جیتے ہوئے بتایا ہے۔ ان کے نسوانی کردار نہ صرف تعلیم یافتہ ہیں، بلکہ لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں حصہ لیتے ہیں، ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ادب کی محفلوں میں شامل ہوتے ہیں، شکار کا شوق بھی پورا کر لیتے ہیں، اور نامساعد حالات میں دوسروں پر انحصار نہیں کرتے بلکہ اپنی دانش مندی سے مرد اساس معاشرہ کا سامنا کرتے ہیں اور جد و جہد سے کامیاب ہو کر اپنے باشعور ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے ناولوں کے نسوانی کردار، اختر النساء، زبیدہ، ثریا، نجمہ، سوشیلا جی، نرملا، مسز وقار وغیرہ کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کرداروں کی فکر و عمل کے ذریعہ نذر سجاد حیدر نے دراصل سماج کے روبرو خواتین کے لیے بھی ایسی زندگی کا تصور رکھا جسے عرصہ دراز سے صرف مردوں کا حق تصور کیا جاتا تھا۔ قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ نذر سجاد حیدر کے ناولوں میں مرد کردار بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ، نہایت مہذب، شائستہ، باوقار اور صنفی مساوات کے علمبردار افراد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو ہر قدم پر عورت کی عزت کرتے' ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے تو لگتا ہے کہ نذر سجاد حیدر نے روایتی صنفی کرداروں کی پیش کشی سے یکسر گریز کرتے ہوئے تعلیم یافتہ و روشن خیال کرداروں اور اہم واقعات کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر ادا کیا ہے۔ ان کا مقصد سماج کے آگے صنفی مساوات کا ایک ایسا بہترین ماڈل تشکیل دینا تھا جو سب کے لیے قابلِ تقلید ہو۔ اگرچہ کہ ان کے ناول سماج کے اعلیٰ و روشن خیال گھرانوں کے پس منظر کو پیش کرتے ہیں تاہم یہ بھی حقیقت ہے اسی پس منظر میں وہ سماج کے دیگر طبقات کی ترجمانی بھی کر جاتی ہیں اور ان کے صنفی مسائل کو مدلل طریقے سے زیرِ بحث لا کر بین السطور میں کئی ایک اہم نکات کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔

''صنفی مساوات کے تصور'' کے حوالے سے نذر سجاد حیدر کا ناول ''مذہب اور عشق'' نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں ''صنفی مساوات'' کے متعلق نہ صرف ان کے نظریات کی بھر پور ترجمانی ہوتی ہے۔ بلکہ قومی و بین الاقوامی سطح پر خواتین کی حیثیت اور ''صنفی مساوات'' کی تحریک کے تعلق سے بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اگر اس ناول کو ''صنفی مساوات کی تحریک'' کی تاریخ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس ناول میں مغربی ممالک کی تحریکاتِ نسواں کے علاوہ ہندوستان میں کی جا رہی جد و جہد کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول کے دو اہم کرداروں ''سوشیلا بائی اور مسز شبیر'' کے درمیان مختلف موقعوں پر گفتگو کے ذریعہ مغربی ممالک اور ہندوستان کی خواتین کے متعلق نہ صرف سماج کے صنفی تصورات کو بڑی خوبی سے زیرِ بحث لایا ہے۔ بلکہ بین السطور میں مذہب اسلام کے ''تصورِ مساوات'' کو دیگر مذاہب کے تقابل کے ساتھ بھی پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس ناول میں خواتین کے ''وجود'' اور ان کے ''حقوق'' سے متعلق مروجہ فرسودہ خیالی پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ ناول کا پلاٹ کچھ اس

طرح سے ڈھالا گیا ہے کہ وقتاً فوقتاً حسب ضرورت مسٹر شبیر اسلام میں مردوں کے برابر خواتین کو دیے گئے تمام مساویانہ حقوق سے سوشیلا بائی کو واقف کرواتے ہیں اور یہ بھی وضاحت کر دیتے ہیں کہ ان نظریات کو ہندوستانی سماج کے پس منظر میں کس طرح سے تبدیل کر دیا گیا جس کی وجہ سے ہندوستان میں مسلم خواتین بھی بنیادی حقوق سے محروم ہو کر رہ گئیں۔جن کی تفصیل سن کر سوشیلا بائی اسلام کے نظریہ مساوات کی قائل ہو جاتی ہے۔دونوں کے درمیان گفتگو کا ایک منظر ملاحظہ کیجیے

''سوشیلا۔عورت کو ساری دنیا ہمیشہ کمزور فطرت ہی سمجھتی رہی ہے
شبیر صاحب۔اسلام تو ان کو مردوں سے کسی طرح کمزور اور
اونیٰ نہیں سمجھتا۔اور اسلام کی عورتوں کے حق میں یہی سب سے
بڑی بخشش ہے کہ اس نے انھیں سوسائٹی میں باعزت جگہ دی۔
سوشیلا۔مجھے اس کا بھی پتہ نہ تھا کہ اسلام نے عورتوں کو قریب
قریب مردوں کے مساوی حقوق دیے ہیں اور اپنے قوانین
میں اس کمزور جنس کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے۔''

(مذہب اور عشق،ص118-117)

نذر سجاد حیدر نے اس ناول میں ''صنفی مساوات'' کے مختلف پہلوؤں کو اسلام کے نظریہ مساوات کے پس منظر میں پیش کیا اور ہندوستان کے تناظر میں عورت و مرد کے درمیان مروج صنفی تفرقہ کو ہندوستانی تہذیب کی دین بتایا۔اس ضمن میں انھوں نے خواتین کے متعلق مذہب اسلام کے نظریات کو بڑے ہی موثر اور مدلل انداز میں پیش کیا۔حتیٰ کہ انھوں نے مغربی ممالک میں فروغ پائے ''صنفی مساوات'' کے تصورات اور ان کے حصول کی کوششوں کو بھی اسلام کے نظریات کا مرہونِ منت بتایا۔جیسا کہ مسٹر شبیر کی زبانی یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے

''یورپ میں عورتوں کی آزادی،حقوق کا احترام بڑی حد تک
اسلام کا ممنون ہے۔''(مذہب اور عشق،ص۔87)

زیر بحث خواتین کے ناولوں کا جائزہ بنیادی طور پر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ہندوستانی خواتین کی زبوں حالی،جغرافیائی،مذہبی،سماجی و تہذیبی اعتبار سے ہندوستان کے کسی بھی مقام پر مختلف نہیں تھی۔مجموعی حیثیت سے طبقہ نسواں ''صنفی عدم مساوات'' کے سماجی نظریات سے اثر پذیر تھا۔مذکورہ تینوں خاتون ناول نگاروں نے تاریخی ادوار سے چلی آ رہی طبقہ نسواں کی پست حیثیت کے پس پردہ عوامل میں ''سماج کے عدم مساویانہ نظریات'' یا ''صنفی تصورات'' کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا۔اور ان کی تبدیلی کے متعلق اپنے اپنے تصورات کو تحریروں میں ڈھالا۔خواتین کی حیثیت میں بہتری کے لیے ان کی تعلیم وترقی کی ضرورت واہمیت پر زور دیا اور ان کے لیے مردوں کے برابر مساوی حقوق و مواقعوں کے مطالبات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔

پیش نظر تحریروں کے مطالعہ و تجزیہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تصورات و نظریات خواتین کی شعوری بیداری کے ابتدائی دور کی نمائندگی کرنے کے باوجود نہایت واضح اور ترقی یافتہ نظر آتے ہیں۔اگرچہ کہ خواتین کے یہ فکری کارنامے اس دور کے رجحانات کے زیر اثر خواتین کی اندرونِ خانہ حیثیت کی بہتری پر زیادہ مرکوز رہے تھے۔لیکن انھوں نے خواتین کی بیرونِ خانہ فعالیت اور تعمیری کردار کی طرف بھی سماج کی توجہ مبذول کروائی۔خواتین کی تحریروں نے مردوں کے برابر خواتین کے مساویانہ مقام و مرتبہ کے لیے نہ صرف سماج کی ذہن سازی کی بلکہ خود خواتین میں پہلی بار ان کے اپنے وجود کی اہمیت،ان کی تعلیم،ان کے شعور کی تربیت،ان کی صحت کی اہمیت اجاگر کی اور انھیں فرسودہ خیالی وضعیف الاعتقادی کے نقصانات سے باخبر کرنے کی نہایت کامیاب کوششیں کیں۔گویا ''صنفی مساوات'' اور ''حقوقِ نسواں'' کے تصورات کے تناظر میں خود خواتین کو اپنے وجود کی اہمیت سے روشناس کروایا۔

بالعموم ''صنفی مساوات'' کی بحث یا نظریات کی اردو ادب میں پیش کشی کو مغرب کی دین قرار دیا جاتا ہے اور اسے 1960 کے بعد لکھے گئے نسائی ادب کا حصہ بنایا جاتا ہے تاہم زیر بحث تحریروں کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان خواتین کے خیالات کسی مغربی تحریک سے اثر پذیر نہیں تھے اور نہ انھوں نے خواتین کی آزادی اور مردوں کے برابر مساویانہ حقوق کے لیے مغربی مفکرین کے نظریات کی پیروی کی تھی بلکہ یہ وہ خواتین تھیں جو عورتوں کے لیے بھی مردوں کے برابر ''انسانی حقوق'' کا واضح تصور رکھتی تھیں اور اسلام کے جدید اور روشن خیال ''نظریہ مساوات'' اور خواتین کو دیے گئے تمام حقوق سے بھی بخوبی واقف تھیں۔بلکہ انھیں حاصل شرعی حقوق کی ہندوستانی سماج میں پامالی کے اسباب سے بھی روشناس تھیں۔یہی وجہ ہے کہ جب انھیں مواقع دستیاب ہونے لگے تب انھوں نے ہندوستانی معاشرہ میں خواتین کے کھوئے ہوئے تشخص کی بحالی،مردوں کے مساوی حقوق اور اپنے سماجی مرتبہ کی بازیافت کے لیے پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ کر ''صنفی مساوات'' کا پرچم تھام لیا۔ بعد کے آنے والے برسوں میں اس پرچم کے سائے تلے خاتون قلم کاروں کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔

Dr. Amna Tahseen
Dept. of Women Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli,Hyderabad-500 032 (T.S)

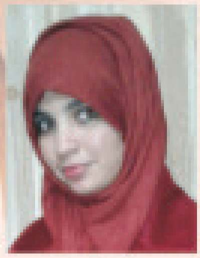

فن خوشنویسی کی ترویج میں خواتین کا حصہ

ثناء رحمٰن

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر تمام مخلوق پر فضیلت و برتری عطا کی ہے۔ پھر خود انسان کو بھی دو اصناف یعنی مرد و عورت میں تقسیم کر دیا۔ ان میں مرد کو قوی وجسیم بنا کر فوقیت تو عطا کی مگر عورت کو بھی کچھ کمالات وفضائل عطا کیے۔ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ مرد کی کامیابی میں کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ضرور ہوا کرتا ہے۔ اب یہ عورت ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کسی بھی شکل میں ہو سکتی ہے۔ بات صرف خانگی یا گھریلو حالات تک ہی محدود نہیں بلکہ آج تو علم وادب اور فن وثقافت کے ساتھ ہی سائنس وٹکنالوجی اور معیشت وتجارت تک میں عورت نہ صرف مرد کے شانہ بہ شانہ ہے بلکہ کچھ میدانوں میں تو اس سے بھی آگے نظر آتی ہے۔ خوشنویسی کا فن مسلمانوں کے جمالیاتی ذوق کا مظہر ہے۔ اس لئے ہمارے باذوق اور اہل فن حضرات نے اپنے اس ذوق جمیل کی تسکین کی خاطر فن خوشنویسی کا سہارا لیا۔ اور قرآنی آیات کی خطاطی کو اس کا ذریعہ بنایا۔ ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی اپنے ایک مضمون میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''مسلمان خطاط نے اپنی تحقیق اور کاوشیں صرف اور صرف کلام اللہ کو جمالیاتی حسن سے مرصع ومزین کرنے کے واسطے انجام دیں۔ اگرچہ مسلمان علماء کے ایجاد شدہ کچھ خطوط ایسے بھی تھے جو مسجد ومحلات وغیرہ میں کتبے لگانے کے واسطے مخصوص تھے۔ جن میں اسحاق بن حماد کے ایجاد کیے ہوئے خطوط سرفہرست ہیں۔ لیکن ہم کو یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ مسجد ومحلات میں جو کتبے نقش کئے جاتے تھے۔ تو ان میں زیادہ تر قرآن حکیم کی آیات ہی تحریر کی جاتی تھیں۔''

فن خطاطی سے مسلمانوں کی دلچسپی کسی مخصوص خطے یا ملک تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ عالمی پیمانے پر مقبول ہوئی۔ جب ہم خطاطی کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن عرب سے ترکستان وایران ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچا اور مختلف سلاطین کے زمانوں میں پروان چڑھتا ہوا مغلیہ دور حکومت تک آیا۔ ان حکمرانوں نے جس فراخ دلی سے اس فن کی قدر دانی کی اس سے یہ بام عروج تک پہنچا۔ جس کے شواہد مولانا معین احمد ندوی کی اس تحریر سے ملتے ہیں:

''جب مغلوں کا دور شروع ہوا تو انہوں نے دوسرے فنون لطیفہ کی طرح خوش خطی اور خطاطی کی بھی بڑی قدر دانی اور سرپرستی کی۔ اور ان میں سے اکثر سلاطین خود بھی اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے۔ وہ اپنے لڑکوں کو دوسرے فنون کی طرح خوش خطی کی بھی تعلیم دلاتے۔ مشہور خطاطوں کی قدر دانی کرتے۔ ان کی لکھی ہوئی تحریروں کو گراں قیمت پر خریدتے تھے۔''

اس اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت کے حکمراں صرف لڑکوں کو ہی خوش نویسی کی تعلیم دلایا کرتے تھے۔ اسی طرح کی ایک اور روایت مولوی احترام الدین شاغل سے بھی ملتی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے:

''اس دور میں مردوں کے سوا کسی کاتب عورت کا پتہ نہیں چلتا۔''

راقم کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مسلم گھرانوں میں عورت کو فکر معاش سے سبکدوش رکھا گیا اور ان کے فرائض خانگی ذمہ داریوں اور بچوں کی پرورش ونگہداشت تک ہی محدود رکھے گئے۔ جبکہ فن خوشنویسی جمالیاتی ذوق کے مظہر سے کہیں زیادہ ذریعہ معاش کے طور پر اپنایا گیا۔ تاریخ میں جس کی مثالیں کثیر تعداد میں ملتی ہیں۔ دشمنان اسلام

نے تو مسلم گھرانوں کی اس تہذیب اور پردے کو آڑ بنا کر مسلمانوں کو ہدف تنقید بنایا۔ لیکن حقیقت بالکل ہی اس کے برعکس ہے۔ اور تاریخی شواہد اس سچائی کو ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں پردے اور کچھ قیود کے باوجود خواتین اسلام نے زندگی کے اکثر میدانوں میں نہ صرف عملی حصہ داری کا ثبوت دیا بلکہ کچھ خاص میدانوں میں تو کارہائے نمایاں بھی انجام دیے ہیں۔ بھلا اس تاریخی سچائی کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے عورت پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کی علمی تاریخ میں ہر ہر محاذ پر عورت کی نمائندگی نظر آتی ہے۔ وہ جہادی دستوں میں، علمی محفلوں میں اور صنعتی و تجارتی سرگرمیوں میں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ تاریخ میں جیسے ہم آگے چلتے ہیں تو ہمیں اسلامی مملکت میں عورت سربراہ کی حیثیت سے بھی نظر آتی ہے۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں پہلی عورت حکمراں کی شکل میں رضیہ سلطان ہی نظر آتی ہے۔ پھر چاند بی بی، نور جہاں اور بیگم حضرت محل کو بھی اس ضمن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ علم و ادب اور فنون و ثقافت کے میدان میں تو کثیر تعداد میں ایسی مثالیں مل سکتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر، عصمت آپا، واجدہ تبسم، رضیہ بٹ، بشریٰ رحمٰن، آمنہ ابو الحسن، کشور ناہید، پروین شیر، پروین شاکر، انجم رہبر، ڈاکٹر شمیم نکہت کے ساتھ ہی دیگر مسلم خواتین اردو میں ادیبہ و شاعرہ کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے یہاں فن خوشنویسی کی آبیاری میں مسلم خواتین کی حصہ داری کو واضح کرنے کے لئے کچھ اہم و ممتاز خواتین اہل فن کا تعارف و تذکرہ نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔

اسماء :قبیلہ بنو عامر کی فاضلہ اندلس کے شہر اشبیلیہ کی رہنے والی تھی۔ اس کی شاعری اور خوشنویسی کا تمام ملک میں شہرہ تھا۔ اس نے عربی میں ایک قصیدہ سردار عبدالمومن بن علی کی شان میں لکھا تھا۔

اسماء عبرت :احمد آقا سا کن قسطنطنیہ کی بیٹی اور محمود خطاط کی بیوی تھی۔ شوہر کی تربیت سے فن خوشنویسی میں کمال حاصل کیا۔ اس کی خوشنویسی کے نمونے آج بھی موجود ہیں اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

بادشاہ بیگم: ان کا بادشاہ بیگم نام تھا۔ شاعری بھی کرتی تھیں۔ تخلص ''مخفی'' تھا۔ چھوٹی بیگم ان کی والدہ کا نام تھا۔ ان کا ڈیرہ دلی میں یوسف والیوں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کتاب ''تذکرۃ النساء'' میں ان کے تعلق سے عبارت ملتی ہے:

''زبان انگریزی سے بہرہ ور اور فارسی خوانی و خوشخطی میں صاحب ہنر ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ کی تحریر بہ خط انگریزی و فارسی یہ خط بھی دیکھی ہے۔ سبحان اللہ خوب لکھتی ہیں خاص خاص مردوں کو اصلاح بھی دیتی ہیں۔''

بادشاہ خاتون : قطب الدین محمد حاکم کرمان کی دختر تھیں۔ شہزادی ہونے کے باوجود نہایت متقی و پرہیزگار تھیں تقوے کا عالم یہ تھا کہ خزانۂ حکومت سے کچھ نہ لے کر اجرت کتابت قرآن سے بسر اوقات کیا کرتی تھیں۔ باپ کے انتقال کے بعد عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لیا اور اہل ہنر اور صاحبان کمال کو نہایت فیاضی و فراخ دلی سے نوازا۔ علم کے ساتھ ہی فن کی پذیرائی بھی کی۔ اور علم دوستوں میں شامل ہوئیں۔

بی بی بنفشہ: شیخ کمال الدین حسین ابن شیخ حسن انصاری کی کنیز تھیں۔ یہ گوناگوں صفات اور فضائل و خصائص سے مالا مال اور خط نستعلیق میں صاحب کمال تھیں۔ عبداللہ سحری جو مشہور شاعر اور خط نستعلیق میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا اس کا بیٹا تھا۔ اس کو آپ کی شاگردی کا شرف بھی حاصل تھا۔

جاریۃ الناصر: آپ خلفائے عباسیہ کے چونتیسویں خلیفہ ناصر الدین اللہ کی کنیز تھیں۔ ان کو خود حاکم وقت اور خلیفۂ عہد نے لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ ذاتی دلچسپی اور سخت محنت کی بناء پر خوشنویسی میں کمال حاصل کیا۔ خلیفہ کے اکثر فرامین آپ ہی اپنے قلم سے لکھا کرتی تھیں۔ جو آپ کے شغف علمی کے ساتھ ہی ہنر میں باکمال ہونے کا بھی ثبوت ہیں۔

جہان خانم: شاہ ناصر الدین قاچار والی ایران کی والدہ تھیں۔ یہ علم و ادب میں کافی شہرت رکھنے کے ساتھ ہی خوشنویسی میں بھی کمال رکھتی تھیں۔ اسی کے ساتھ ہی علم سیاست میں بھی ان کو کافی دخل تھا۔ اور امور سلطنت میں بھی دستگاہ رکھتی تھیں۔

جہاں آرا بیگم : یہ شاہ جہاں اور ممتاز محل کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے اعلیٰ علمی فضا میں رہ کر اپنی علم پروری اور کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ عالمہ، فاضلہ کے ساتھ ہی شاعرہ بھی تھیں۔ صوفیائے اسلام سے حد درجہ عقیدت تھی۔ ان کا تذکرہ بعنوان ''مونس الارواح'' بھی تحریر کیا۔ خوشخطی میں بھی ان کا مرتبہ استادانہ تھا 1092ھ م 168 میں انتقال ہوا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ میں آپ کی قبر ہے جس پر یہ شعر لکھا ہوا ہے

بغیر سبزہ نہ پوشد کس مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

خاتون : سلطان قطب الدین شاہ محمد کی لڑکی اور نہایت تعلیم یافتہ تھیں۔ 690ھ م 1291 میں تخت نشین ہوئیں۔ علم اور اہل علم کی قدر دانی میں مشہور تھیں۔ خوشنویسی کے ساتھ ہی شاعری میں بھی یگانہ

روزگار تھیں۔ اپنا اکثر وقت کتاب اللہ کی کتابت میں صرف کرتی تھیں۔ 692ھ م 1292 میں دوسرے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہو کر راہی ملک بقا ہوئیں۔

زیب النساء بیگم: یہ اورنگ زیب عالم گیر کی بیٹی ہیں۔ ان کی ماں کا نام دل رس بانو بیگم تھا۔ جو شاہ نواز صفوی کی بیٹی تھیں۔ ان کا سنہ ولادت 1048ھ م 1638 ہے۔ شہزادی کو اللہ تعالیٰ نے حسن ظاہری کے ساتھ ہی حسن باطنی سے بھی نوازا تھا۔ کلام اللہ کی حافظہ تھیں۔ خط نستعلیق میں آقا عبدالرشید دیلمی کی شاگرد تھیں۔ خط نسخ اور شکستہ بھی اچھا لکھتی تھیں۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ مخفی تخلص رکھتی تھیں۔ دیوان ان کا طبع ہو چکا ہے۔ فن انشا میں ''زیب المنشات'' اہم تصنیف ہے۔ 1112ھ م 1700 ان کا سنہ وفات ہے۔

زینب سلطان: مقصود علی خوشنویس کی دختر تھیں۔ ایک نسخہ ''دیوان شریف'' کتب خانہ مدرسہ سپہ سالار میں محفوظ ہے۔ جو خوش خط اور خفی نستعلیق میں کتابت کیا گیا ہے۔ جس پر ترقیمہ ''کتبہا بنت مقصود علی، زینب سلطان''

زینب شہیدہ: یہ احمد مفرج خراسانی۔۔۔ حسن و جمال اور فضل و کمال میں شہرۂ آفاق تھیں۔ خوش نویسی میں بھی اپنے زمانے کے خوش نویسوں پر فضیلت رکھتی تھی۔ اس فن میں ان کی لیاقت و صلاحیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے استاد کامل یعقوب مستعصمی نے بھی خط کی تعلیم انہیں سے حاصل کی تھی۔ خط نسخ و ثلث بھی اعلیٰ درجے کی لکھتی تھیں۔ 80 سال کی عمر میں 574ھ م 1179 میں ان کا انتقال ہوا۔

سعید جہاں بیگم: ان کا قلمی و فنی نام ''سعید رقم'' تھا۔ مولوی احترام الدین نے ان کا ذکر ''الحاج قاضی محمد یعقوب علی'' کے تذکرہ میں ان کے شاگردوں کے زمرے میں کیا ہے۔

سلطانم بانو صفوی: شاہ اسماعیل صفوی کی دختر تھیں۔ بقول صاحب ''گلستان ہنر'' خط کی تعلیم دوست محمد سے حاصل کی تھی۔ آپ کے تحریر کردہ دو قطعہ ''از مرقع بہرام میرزا'' کتب خانہ خزینۂ اوقاف استنبول میں محفوظ ہیں۔ جس پر ''کتبہ سلطانم بن اسماعیل الصفوی'' ترقیمہ ہے۔

صفیہ (اول): اشبیلیہ کی رہنے والی تھیں۔ نہایت فصیح و بلیغ شاعرہ ہونے کے ساتھ ہی فن خوشنویسی میں بھی کمال رکھتی تھیں۔ ان کی تحریریں بڑی مقبول تھیں۔ دور دراز کے لوگ بھی ان کی وصلیوں کی نقل کرانے آتے تھے۔

صفیہ (دوم): سلطان عبدالرحمٰن ثالث ''والی اندلس'' کے عہد کی فاضلہ تھیں۔ ان کے والد کا نام عبداللہ رازی تھا۔ یہ شاعرہ اور خوشنویسہ بھی تھیں۔ ان کا خط بھی پسندیدہ عوام و خواص تھا۔

صفینہ: یہ اندلس کی وہ بلند مرتبہ خاتون تھیں جن کی نسبت ''اسلامی کتب خانوں کی سیر'' کے مصنف ص 19 پر لکھتے ہیں:

''وہ خطاطی میں بڑی مہارت رکھتی تھیں۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں معاصرین کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔''

عابدہ: یہ قرطبہ کے حاکم احمد ابن محمد کی بیٹی تھیں۔ علوم و فنون میں طاق ہونے کے ساتھ ہی فن کتابت میں بھی یکتائے زمانہ تھیں۔ ان کے فن سے متاثر ہو کر اندلس کے علم دوست خلیفہ الحکم نے انہیں قدر و منزلت سے نوازا۔ موصوف نے اپنے کتب خانے کے لئے بہت سی کتابیں ان سے لکھوائی تھیں۔

عائشہ (اول): مولانا فتح اللہ عسقلانی کی پوتی اور قاضی صدر الدین حنبلی کی بیٹی تھیں۔ فن خوشنویسی میں ان کو یکتائے روزگار ہونے کا فخر حاصل تھا۔ 768ھ م 1366 ان کا سال ولادت ہے۔

عائشہ (دوم): یہ احمد قرطبوی کی لڑکی تھیں۔ علم و فضل میں با کمال، شعر و ادب میں بے مثال اور فن خطاطی میں شہرۂ آفاق تھیں۔ آپ کے دست با کمال سے لکھی ہوئی کتابیں علمائے اندلس کے پڑھنے میں آئیں۔

غصینہ: یہ ایک اندلسی خاتون ہیں۔ فن خوشنویسی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں نادر روزگار تھیں۔ ان کی تحریر ہم عصروں کو محو حیرت بنا دیتی ہے۔

فاطمہ بنت احمد حسین: یہ جعفر برمکی کی زوجہ تھیں۔ یہ فن خوشنویسی اور حساب دانی میں یگانۂ روزگار تھیں۔ خلیفہ ہارون رشید کی رضاعی والدہ تھیں۔ خاندان برامکہ کی تباہی تک یہ زندہ رہیں۔

فاطمہ بنت سلطان محمد سلجوق: یہ خلیفہ المقتفی لامر اللہ کی زوجہ تھیں۔ نہایت تعلیم یافتہ، فن خوشنویسی کی ماہر اور سیاسی و ملکی امور میں صائب الرائے تھیں۔ خلیفہ کی جانب سے فرامین و مراسلات لکھا کرتیں۔ 542ھ م 1147 میں وفات پائی۔

فاطمہ العطاری: یہ حسن بن العطار کی دختر اور بنت الاقرع کے نام سے مشہور تھیں۔ آپ نے فن خطاطی میں کمال حاصل کیا۔ ممالک غیر کو جو صلح نامہ جاتے وہ آپ کے ہی کتابت شدہ ہوا کرتے تھے۔ آپ کے خط سے خوش ہو کر امیر عمید الملک ابونصر کندی نے ایک ہزار دینار

عطا کیے۔

فلمہ : خلیفہ عبدالرحمٰن الاوسط کی کنیز تھیں۔ جو حسن و جمال اور عقل و کمال میں لاثانی تھیں۔ اور فن خطاطی میں بھی ان کو دسترس حاصل تھی۔

گل بدن بیگم: ہندوستان کے مشہور بادشاہ بابر کی بیٹی تھیں۔ فن خوشنویسی میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ ''ہمایوں نامہ'' ان کی مشہور کتاب ہے۔

گوھر شاد خانم : میر عماد کی دختر تھیں۔ انہی سے علوم و فنون کی تکمیل کی۔ نستعلیق نہایت پاکیزہ لکھتی تھیں۔ اپنے عہد میں خواتین میں فن خوشنویسی میں یکتا تھیں۔ اپنے بیٹے کو بھی خوشنویسی کی تعلیم دی۔ تا عمر فن کی خدمت کرتی رہیں۔

نواب ملکہ جہاں : نواب محمد علی شاہ کی ملکہ تھیں۔ خط نسخ میں کمال حاصل تھا۔ لکھنؤ وطن تھا۔ ایک قرآن مجید اور حضرت سیدۃ النساء کی سوانح عمری ان کا قلمی شاہکار ہے۔

ماہ شرف: ''مجمع الفصحا'' کی روایت کے بقول آپ ابو الحسن بیگ کی دختر تھیں۔ عورتوں میں خوبصورت، دانشمند اور ہنر مند و بہترین کاتبہ تھیں۔ شاعرہ بھی تھیں۔ ان کا تخلص ''مقصورہ'' تھا۔ یہ 1263ھ م1846 میں فوت ہوئیں۔

ملک شاد خانم: یا میر تیمور کی پڑپوتی اور میرزا سلطان محمد ابن میرزا جہانگیر کی بیٹی تھیں۔ فن خوشنویسی میں شہرۂ آفاق تھیں۔ اس فن میں ان کے کمال کا اندازہ اس سے لگایئے کہ انہوں نے خط ریحان میں کلام مجید لکھا تھا جس کے خاتمے پر خط رقاع میں اپنا نام و نسب تحریر کیا تھا۔

ملکہ نور جہاں: مشہور ملکہ جہانگیر جس کو خدا نے حسن ظاہری کے ساتھ ساتھ حسن باطنی سے بھی دل کھول کر نوازا تھا۔ یہ عظیم الشان شاعرہ ہونے کے ساتھ ہی بے مثال خوشنویسہ بھی تھیں۔ مزاج میں نفاست بلا کی تھی۔ یہی خوبی ان کے فن میں بھی نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے اعلیٰ درجے کی خطاط تھیں۔ بالخصوص خط نستعلیق بہت عمدہ لکھتی تھیں۔ علم و فن کے ساتھ ہی دیگر اور چیزوں میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ کچھ چیزوں کی تو یہ موجد تسلیم کی جاتی ہیں۔

یاسمین بو : یہ میرزا عسکر دام خانی کی ہمسر اور گلبرگہ شریف کی رہنے والی تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد امرائے گورکانی کے ساتھ دہلی ہجرت کر گئیں اور تمام زندگی باعزت رہ کر وہیں گزار دی۔ یوں تو تمام خطوط لکھنا جانتی تھیں۔ مگر نستعلیق، ثلث، نسخ اور شکستہ لکھنے میں ان کو بطور خاص مہارت حاصل تھی۔

سطور بالا میں بیان کردہ حقائق سے اس کا بخوبی ثبوت ملتا ہے کہ خواتین اسلام نے مذہب اور معاشرتی اعتبار سے کچھ بندشوں اور پابندیوں کے باوجود حصول علم میں لاپرواہی وبے توجہی نہیں برتی بلکہ اس کی تحصیل میں پوری طرح دلچسپی لی۔ اور دیگر اور علوم و فنون کی طرح فن خوشنویسی سے وابستگی کا اظہار کیا اس فن سے عقیدت و محبت کا عمل ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے اس کو سیکھنے میں زبردست ذوق و شوق کا مظاہرہ کیا اور فن کی ترقی و ترویج میں اپنی حصہ داری درج کرا کر اپنے ذوق حسن تحریر کا اظہار کیا۔ اور فنی جمالیات کی تاریخ میں اپنا نام رقم کرا دیا۔

Sana Rahman
Principal
Allama Iqbal School
Miyan Sarai, Katra Bazar
Sambhal-244302 (U.P)

فرہنگ آصفیہ

آوا۔ ہ۔ اسم مذکر۔ ف۔ (آوہ) از (نفایس) انگریزی اوون۔ (oven) سکسن افن (ofen) عربی میں اتون۔ کمہار کی بھٹی۔ کمہاروں کے برتن پکانے کا گڑھا۔ پزاوہ۔ بھٹا۔ (مثلیں) ماں کا پیٹ کمہار کا آوا کوئی کالا کوئی گورا۔ ایک آوے کے برتن ہیں۔ (فقرہ) کسی کا آوا بگڑے انکے کھد انیکا کھد انہ بگڑا ہوا ہے۔

آواز۔ ف۔ اسم مؤنث۔ ژ۔ (آواج) پہلوی۔ (باز۔ فراز) عوام۔ اوان۔ ( ) شبد۔ بول۔ الاپ۔ بانگ۔ پکار۔ صدا۔ ٹیر۔ نوا۔ ندا۔ دھن۔ لہجہ۔

مر گئے سب شب فرقت میں الٰہی شاید
نہ مؤذن کی صدا ہے نہ گجر کی آواز (اسیر)
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور (غالب)

قدسیہ انجم (علیگ)

ٹریجڈی کوئن

مینا کماری

مہ جبیں عرف مینا کماری 1933 کو پیدا ہوئیں۔ مینا کماری کو فلموں میں ان کے پُردرد رول کے لیے ٹریجڈی کوئین کا خطاب دیا گیا۔ مینا کماری نے زیادہ تر سنجیدہ اور غمگین کردار نبھائے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مینا کماری اداکارہ کے علاوہ ایک شاعرہ بھی تھیں ایسی شاعرہ جس کی زندگی میں تلخیاں اور رنج گھلے ہوئے تھے مگر وہ اپنے ان جذبات کو چھپاتی نہیں بلکہ اپنی شاعرانہ صلاحیت سے اپنے دل کے درد کو ان سروں میں اتارتی ہیں۔

ٹکڑے ٹکڑے دن بیتا
جس کا جتنا آنچل تھا
دھجّی دھجّی رات ملی
اتنی ہی سوغات ملی

مینا کماری کی شاعری میں حسرت و یاس کا فلسفہ نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں وہ اپنی زندگی سے غیر مطمئن بھی نظر آتی ہیں۔ حسین خوابوں کی طلسم شکنی اور زندگی سے اکتا کر کہتی ہیں۔

سانس بھرنے کو تو جینا نہیں کہتے یا رب
جیسے جاگی ہوئی آنکھوں میں چبھے کانچ کے خواب
دل ہی دکھتا ہے نہ اب آس کی در ہوتی ہے
رات اسطرح دیوانوں کی بسر ہوتی ہے

انہوں نے زندگی میں اتنے دکھ جھیلے کہ وہ دکھ سے ہی پیار کرنے لگیں۔ وہ سراپا درد محسوس ہوتی ہیں۔ اُنکی آنکھوں سے بھی ایک کرب کا اظہار ہوتا ہے۔ اور جب اپنی لکھی ہوئی غزلوں کو اپنی سریلی آواز میں گاتی ہیں تو اس میں ایک گہرائی اور دل کو چھونے کا ہنر محسوس ہوتا ہے۔

غم ہی دشمن ہے میرا غم کو ہی دل ڈھونڈتا ہے
ایک لمحہ کی جدائی بھی اگر ہوتی ہے

اُن کی روح پتہ نہیں کس کو تلاش کر رہی ہے

ایک مرکز کی تلاش ایک بھٹکتی خوشبو
کبھی منزل، کبھی تمہید سفر ہوتی ہے

ان کے ہر ہر لفظ سے زندگی کی محرومیاں جھلکتی ہیں مگر پھر بھی وہ اپنے خیالوں کی دنیا بنا کر اپنے تخیّل اور اپنے تصور میں کھو کر اپنے قلم سے لفظوں کا جادو جگاتی ہیں۔

دھواں دھواں سی نظر اور وہی سناٹے
سوال بن گئی ہے وجہ زندگی پھر سے
پھر سے احساس نے پہنا ہے بے بسی کا لباس
جواب جس کا وہی حیران سی خاموشی

ان کی نسوانیت، ان کی انفرادیت، ان کی بے پناہ خوبصورتی، ان کی اداکاری اور سب سے بڑھ کر روح میں اُترتی ہوئی ان کی درد بھری آواز سحر انگیز شخصیت کا پتہ دیتی ہے۔ وہ خوبصورت تھیں یا پھر ان کی آواز کی گہرائی، کہنا مشکل ہے۔ وہ اپنے محبوب کو عمر بھر ڈھونڈتی رہیں جس کا انہیں ہمیشہ اس کا انتظار رہا ہے۔

کسی کو ہم نفس کہنے کی جستجو میں رہا
تڑپ کے پلٹے اچانک اسے پکار اٹھے
کوئی تو ہو جو بیساختہ اس کو پہچانے
میرے ہم نفس! میرے ہم نفس!

وہ اپنے خیالی دوست سے سرگوشیوں میں بات کرتی ہوئی محسوس

ہوتی ہیں۔

میری اداسیوں کے حصہ دار
میرے اکیلے پن
میرے ادھورے پن کے دوست
تمام زخم جو تیرے ہیں میرے درد تمام
تیری کراہ کا رشتہ ہے میری آہوں میں

وہ عمر بھر سچے پیار کو ترستی رہیں۔ وہ تصور میں خواب بھی دیکھتی ہیں۔ ان کی شخصیت لازوال ہے۔ ان کی درد بھری آواز اور اس پر انکے لفظوں کا جادو ایسا لگتا ہے کہ کسی پہاڑ سے کوئی خوبصورت جھرنا دھیرے دھیرے گر رہا ہو۔

جب زلف کی کالکھ میں
بدنام سہی لیکن گمنام نہیں ہوتا
گھل جائے کوئی راہی
آغاز تو ہوتا ہے انجام نہیں ہوتا

ان کو فلموں میں بھی درد بھرے گیت بہت پسند تھے۔ لتا منگیشکر کا گایا نغمہ ''تم کیا جانو تمہاری یاد میں ہم کتنا روئے'' انہیں بہت پسند تھا۔ ان کی شاعری اور درد بھرے گیتوں سے محبت شیکسپیر کی ان سطروں کو پوری طرح ہی ثابت کرتی ہے۔ ''ہمارے سب سے پیارے گیت وہ ہیں جو ہمارے غمگین خیالات کا اظہار کرتے ہیں'' انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ دن نہیں جی پائیں گی۔ شاید وہ اپنی موت کے بارے میں لکھ رہی ہیں۔

یہ نور کیسا ہے راکھ کا سرن پہنے
برف کی لاش کا در یہ ہے
لاوے کا بدن پہنے
گونگی چاہت ہے
رسوائی کا کفن پہنے
یہ کیسا شور ہے جو
بے آواز پھیلا ہے
روپہلی چھاؤں میں بدنامیوں کا ڈیرا ہے
احساس بیکراں پہ یہ سرحد کیسی؟

وہ محبت اور موت کو ایک ہی نام سے یاد کرتی ہیں۔ ان کی سہمی ہوئی زندگی کو خوابوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ہر ایک موڑ پر بس دو ہی نام ملتے ہیں
موت کہہ لو جو محبت نہ کہنے پاؤ

شادی کے بعد بھی وہ پیار کو ترستی رہیں تنہائی کا یہ درد ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔ اس لئے تو وہ کہتی ہیں۔

چاند تنہا ہے آسماں تنہا
زندگی کیا اسی کو کہتے ہیں
دل ملا ہے کہاں کہاں تنہا
جسم تنہا اور جاں تنہا

31/ مارچ 1972 کو لمبی بیماری کے بعد اس نامہربان دنیا کو الوداع کہا۔ فلمی دنیا میں ان کا منفرد مقام ہے۔ انکی خوبصورتی، ان کی پرکشش آواز، ان کی شاعری اور فلموں میں نبھائے گئے ان کے کرداروں نے انہیں ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بنا دیا۔ جس کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ شاید انہیں اپنی موت کا احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے لیے ہی یہ الفاظ کہے تھے۔

راہ دیکھا کرے گا صدیوں تک
چھوڑ جائیں گے یہ جہاں تنہا

Dr. Qudsia Anjum
Pricipal
Hindu Girls College
Saharanpur-(U.P)

گذشتہ سے پیوستہ

خواجہ عبدالمنتقم

خواتین کے خلاف خانگی تشدد کے خاتمے کا قانون

تحفظ افسر کی طرف سے اپنا فرض انجام نہ دینے کے لیے سزا

33- اگر کوئی تحفظ افسر کسی معقول وجہ کے بغیر حکم تحفظ میں مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق اپنے فرائض انجام دینے میں قاصر رہے یا انجام دینے سے انکار کرے تو اسے ایک سال تک کی قید یا بیس ہزار روپے تک کے جرمانے یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

تحفظ افسر کے ذریعے جرم کا اختیار سماعت

34- تحفظ افسر کے خلاف کوئی استغاثہ یا دیگر قانونی کارروائی دائر نہیں ہوگی تا وقتیکہ اس کے خلاف ریاستی حکومت یا اس کے ذریعے مجاز کردہ کسی افسر کی ماقبل منظوری سے شکایت دائر نہ کی جائے۔

نیک نیتی سے کی گئی کارروائی کا تحفظ

35- تحفظ افسر کے خلاف اس ایکٹ یا اس کے تحت بنائے گئے کسی قاعدہ یا صادر کیے گئے حکم کے تحت نیک نیتی سے کیے گئے یا کیے جانے والے فعل سے واقع شدہ نقصان یا ممکنہ طور پر ہونے والے نقصان کے لیے کوئی دعویٰ استغاثہ یا دیگر قانونی کارروائی دائر نہیں ہوگی۔

یہ ایکٹ کسی دیگر قانون کی تنقیص نہیں کرے گا

یہ ایکٹ کسی دیگر قانون تنقیص نہیں کرے گا

36- اس ایکٹ کی توضیعات فی الوقت نافذ العمل کسی دیگر قانون کی توضیعات کے علاوہ ہوں گی اور اس کی تنقیص نہیں کریں گی۔

مرکزی حکومت کو قواعد بنانے کا اختیار

37- (1) مرکزی حکومت اس ایکٹ کی توضیعات روبہ عمل لانے کے لیے اطلاع نامہ کے ذریعے قواعد بنا سکے گی۔

(2) بالخصوص اور ماقبل اختیارات کو مضرت پہنچائے بغیر ایسے قواعد حسب ذیل تمام امور یا کسی امر کی نسبت توضیع کر سکیں گے:

(الف) اہلیتیں اور تجربہ جو ایک تحفظ افسر کو دفعہ 8 کے تحت ذیلی دفعہ (2) کے تحت ہونا چاہیے؛

(ب) دفعہ 8 کی ذیلی دفعہ (3) کے تحت تحفظ افسر اور اس کے ماتحت دیگر افسران کی ملازمت کی شرائط و قیود؛

(ج) دفعہ 9 کی ذیلی دفعہ (1) کے فقرہ (ب) کے تحت فارم اور طریقہ جس میں گھریلو تشدد کی نسبت رپورٹ دی جا سکے گی؛

(د) دفعہ 9 کی ذیلی دفعہ (1) کے فقرہ (ج) کے تحت فارم اور طریقہ جس میں حکم تحفظ کے لیے درخواست دی جا سکے گی؛

(ھ) دفعہ 9 کی ذیلی دفعہ (1) کے فقرہ (د) کے تحت فارم جس میں شکایت دائر کی جا سکے گی؛

(و) دفعہ 9 کی ذیلی دفعہ (1) کے فقرہ (ط) کے تحت دیگر فرائض جن کو تحفظ افسر انجام دے سکے گا؛

(ز) دفعہ 10 کی ذیلی دفعہ (1) کے تحت خدمت فراہم کنندگان کا رجسٹریشن منضبط کرنے کے لیے قواعد؛

(ح) اس ایکٹ کے تحت امداد طلب کرنے کے لیے دفعہ 12 کی ذیلی دفعہ (1) کے تحت فارم جس میں درخواست دی جا سکے اور مذکورہ دفعہ کی ذیلی دفعہ (3) کے تحت ایسی درخواست میں جو تفاصیل درج ہوں؛

(ط) دفعہ 13 کی ذیلی دفعہ (1) کے تحت نوٹس ہائے کی تعمیل کرانے کے ذرائع؛

(ی) دفعہ 13 کی ذیلی دفعہ (1) کے تحت تحفظاتی افسر کے ذریعے نوٹس

کی تعمیل سے متعلق اقرار کا فارم؛
(ک) دفعہ 14 کی ذیلی دفعہ (1) کے تحت مشورہ دینے کے لیے خدمت فراہم کنندہ کے کسی رکن کو جو اہلیتیں اور تجربہ ہونا چاہیے؛
(ل) دفعہ 23 کی ذیلی دفعہ (2) کے تحت فارم جس میں متاثرہ شخص حلف نامہ داخل کر سکے گا؛
(م) کوئی دوسرا معاملہ جس کی صراحت کرنی ہو یا صراحت کی جائے۔
(3) اس ایکٹ کے تحت بنایا ہوا ہر ایک قاعدہ بنائے جانے کے بعد جس قدر جلد ہو سکے، 30 دن کی مجموعی مدت تک پارلیمنٹ کے ہر ایک ایوان میں جب اس کا اجلاس جاری ہو، رکھا جائے گا اور یہ مدت ایک ہی اجلاس یا دو یا زائد کے بعد دیگرے آنے والے اجلاسوں کے دوران ہو سکتی ہے، اور اگر متذکرہ بالا اجلاس یا اجلاسوں کے فوری بعد ہونے والے اجلاس کے منقضی ہونے سے پہلے دونوں ایوان اس قاعدے میں کسی قسم کا رد و بدل کرنے پر اتفاق کریں یا دونوں ایوان متفق ہوں کہ یہ قاعدہ نہیں بنانا چاہیے تو اس کے بعد وہ قاعدہ ایسی رد و بدل کی ہوئی صورت میں موثر ہوگا یا کوئی اثر نہ رکھے گا، جیسی کہ صورت ہو، تاہم ایسی کوئی ترمیم یا کالعدمی کے تحت ماقبل کیے گئے کسی امر کے جواز کو مضرت نہ پہنچائے ذیلی دفعہ (1) کے تحت ہر درخواست ایسے فارم میں ہوگی اور اس میں ایسی تفاصیل درج ہوں گی۔

باب-3
جہیز کے لین دین سے متعلق قانون

ہم سب اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہمارے ملک میں زمانۂ قدیم سے جہیز لینے اور دینے کا رواج رہا ہے۔ اب اس رواج نے ایک لعنت اور جرم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کو روکنے کے لیے حکومت ہند نے ممانعت جہیز ایکٹ کے نام سے موسوم 1991 میں ایک قانون بنایا تھا لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس پر ایمانداری سے عمل نہیں کیا جا رہا ہے۔ سب کچھ حکومت نہیں کر سکتی۔ عوام کو بھی قانون کا پاس ہونا چاہیے۔ جب تک معاشرتی تبدیلی نہیں آئے گی تب تک یہ لعنت ختم نہیں ہو سکتی۔ آیئے اب اس قانون کی مختلف دفعات پر روشنی ڈالیں تا کہ قارئین کو متعلقہ امور کی نسبت قانونی صورت حال واضح ہو جائے۔

ممانعت جہیز ایکٹ، 1961
(The Dowry Prohibition Act)
ایکٹ نمبر 28 بابت 1961

جہیز کے لین دین کی ممانعت کے لیے ایکٹ

1- مختصر نام، وسعت اور نفاذ: (1) اس ایکٹ کا مختصر نام جہیز ممانعت ایکٹ، 1961 ہے۔
(2) اس کا اطلاق ماسوائے ریاست جموں وکشمیر کے پورے بھارت پر ہوگا۔
(3) یہ اس تاریخ کو نافذ ہوگا جو مرکزی حکومت گزٹ میں اطلاع نامے کے ذریعہ مقرر کرے۔
2- جہیز کی تعریف: اس ایکٹ میں، جہیز سے کوئی ایسی جائیداد یا قیمتی سیکوریٹی مراد ہے جو شادی کے موقع پر یا اس سے قبل یا اس کے بعد۔
(الف) شادی کا ایک فریق، شادی کے دوسرے فریق کو؛ یا
(ب) شادی کے کسی بھی فریق کے ماں باپ یا کوئی دیگر شخص شادی کے کسی بھی فریق کو یا کسی دیگر شخص کو متذکرہ فریقین کی شادی کے سلسلے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ دی گئی ہے یا دی جانے کے لیے قرار کیا گیا ہے لیکن اس کا اطلاق ان لوگوں کی بابت نہیں ہوگا جن پر مسلم عائلی قانون (شریعت) کا اطلاق ہوتا ہے، اور ان میں مہر شامل نہیں ہے۔
تشریح-2: قیمتی سیکوریٹی کا وہی مطلب ہے جو مجموعہ تعزیرات بھارت (1860 کا 45) کی دفعہ 30 میں ہے۔
3- جہیز کے لین دین کے لیے سزا: (1) اگر کوئی شخص، اس ایکٹ کے نفاذ کے بعد جہیز دے گا یا لے گا یا جہیز دینے یا لینے کی ترغیب دے گا تو وہ کم سے کم 5 سال اور 15 ہزار روپے تک کے جرمانے کا یا ایسے جہیز کی قیمت کی رقم تک کا، ان میں سے جو بھی زیادہ ہو، مستوجب ہوگا۔
لیکن عدالت ایسی معقول اور خصوصی وجوہات کی بنا پر جنھیں فیصلے میں قلم بند کیا جائے گا 5 سال سے کم مدت کی سزا بھی عائد کر سکے گی۔
(2) ذیلی دفعہ (1) کی کوئی بات،......
(الف) ایسے تحائف کو، جو شادی کے وقت دلہن کو (اس کی بابت بغیر کسی مانگ کے) دیے جاتے ہیں یا ان کے متعلق لاگو نہیں ہوگی۔

لیکن یہ تب، جبکہ ایسے تحائف اس ایکٹ کے تحت بنائے گئے قواعد کے مطابق رکھی گئی فہرست میں درج کیے جاتے ہیں؛

(ب) ایسے تحائف جو شادی کے وقت دولہا کو (اس کی بابت بغیر کسی مانگ کے) دیے جاتے ہیں یا ان کے متعلق لاگو نہیں ہوگی،

لیکن یہ تب جبکہ ایسے تحائف اس ایکٹ کے تحت بنائے گئے قواعد کے مطابق رکھی گئی فہرست میں درج کیے جاتے ہیں:

لیکن مزید یہ کہ جہاں ایسے تحائف جو دلہن کے ذریعہ یا اس کی جانب سے یا کسی ایسے شخص کے ذریعہ جو دلہن کا رشتہ دار ہے، دیے جاتے ہیں وہاں ایسے تحائف رسمی قسم کے ہیں اور ان کی قیمت، ایسے شخص کی مالی حیثیت کو دھیان میں رکھتے ہوئے جس کے ذریعہ یا جس کی جانب سے ایسے تحائف دیے گئے ہیں، زیادہ نہیں ہے۔

4- **جہیز مانگنے کے لیے سزا:** اگر کوئی شخص، حسب صورت دلہن یا دولہا کے والدین یا دیگر رشتہ دار یا ولی سے کسی جہیز کی بالواسطہ یا بلا واسطہ مانگ کرتا ہے تو وہ کم سے کم 6 ماہ اور زیادہ سے زیادہ 2 سال کی مدت کی قید کا اور 10 ہزار روپے تک کے جرمانے کی سزا کا مستوجب ہوگا۔

4-الف **تشہیر پر پابندی:** اگر کوئی شخص،۔۔۔

(الف) کسی اخبار، رسالے، جریدے یا ذرائع ابلاغ میں سے کسی کے ذریعہ کسی اشتہار میں اپنے بیٹے یا اپنی بیٹی یا کسی دیگر رشتہ دار کی شادی کے زر بدل کے طور پر اپنی جائیداد یا کوئی روپیہ پیسہ یا دونوں اپنے کسی کاروبار یا مفاد میں حصے کے طور پر دینے کی پیشکش کرتا ہے،

(ب) فقرہ (الف) میں محولہ کسی اشتہار کو چھاپتا ہے یا شائع کرتا ہے یا ادھر ادھر بھیجتا ہے، تو وہ کم از کم 6 ماہ کی اور زیادہ سے زیادہ 5 سال کی قید یا 15 ہزار روپے تک کے جرمانے کا مستوجب ہوگا۔

لیکن عدالت ایسی معقول اور خصوصی وجوہات کی بنا پر جنہیں فیصلے میں قلم بند کیا جائے گا 6 ماہ سے کم مدت کی بھی سزا عائد کر سکے گی۔

5- **جہیز کے لین دین کے لیے قرار کا باطل ہونا:** جہیز دینے یا لینے کے لیے کیا گیا کوئی بھی قرار باطل ہوگا۔

6- **جہیز کا بیوی یا اس کے وارثوں کے فائدے کے لیے ہونا:** (1)

جہاں کوئی جہیز ایسی عورت سے مختلف، جس کی شادی کے سلسلہ میں وہ دیا گیا ہے، کسی شخص کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے، وہاں وہ شخص، اس جہیز کو؛

(الف) اگر وہ جہیز شادی سے قبل حاصل کیا گیا تھا تو شادی کی تاریخ کے بعد تین ماہ کے اندر؛ یا

(ب) اگر وہ جہیز شادی کے وقت یا اس کے بعد حاصل کیا گیا تھا تو اسے حاصل کرنے کی تاریخ کے بعد تین ماہ کے اندر، یا

(ج) اگر وہ اس وقت حاصل کیا گیا تھا جب وہ عورت نابالغ تھی تو اس کے 18 سال کی عمر پوری کرنے کے بعد تین ماہ کے اندر عورت کو منتقل کردے گا اور ایسی منتقلی تک عورت کے فائدے کے لیے امانت میں رکھے گا۔

(2) اگر کوئی شخص حسب حکم ذیلی دفعہ (1) اس کے لیے صراحت کردہ میعاد کے اندر کسی جائیداد کو منتقل نہیں کر پاتا ہے تو وہ کم سے کم 6 ماہ اور زیادہ سے زیادہ 2 سال کی مدت کی سزا کا یا جرمانے کی سزا کا، جو 10 ہزار روپے تک کا ہو سکے گا، مستوجب ہوگا۔

(3) جہاں ذیلی دفعہ (1) کے تحت کسی جائیداد کے لیے حقدار عورت کی اسے حاصل کرنے سے پہلے موت ہو جاتی ہے تو وہاں عورت کے وارث فی الوقت قابض شخص سے دعویٰ کرنے کے حقدار ہوں گے۔

لیکن اگر ایسی عورت کی قدرتی وجوہات سے مختلف وجوہات کی بنا پر اپنی شادی کے 7 سال کے اندر موت ہو جاتی ہے تو ایسی جائیداد،۔۔۔

(الف) اگر اس کے کوئی بچہ نہیں ہے تو اس کے والدین کو منتقل کردی جائے گی، یا

(ب) اگر اس کے بچے تھے تو اس کے بچوں کو منتقل کردی جائے اور ایسی منتقلی تک اسے ایسے بچوں کے لیے امانت میں رکھا جائے گا۔

(3 الف) جہاں حسب حکم ذیلی دفعہ (1) یا ذیلی دفعہ (3) کے ذریعہ مطلوبہ جائیداد منتقل نہ کرپانے کے باعث ذیلی دفعہ (3) کے تحت مجرم ٹھہرائے گئے کسی شخص نے، اس ذیلی دفعہ کے تحت اس کے مجرم ٹھہرائے جانے سے قبل ہی ایسی جائیداد کو اس کے لیے حقدار عورت کو یا حسب صورت اس کے وارثوں، والدین یا بچوں کو منتقل نہیں کیا ہے، وہاں عدالت اس ذیلی دفعہ کے تحت سزا تجویز کرنے کے علاوہ تحریری حکم کے ذریعہ ہدایت دے گی کہ

ایسا شخص، ایسی جائیداد کو، حسب صورت، ایسی عورت یا اس کے وارثوں، والدین یا بچوں کو ایسی معیاد کے اندر جس کی حکم میں صراحت کی جائے، منتقل کرے اور اگر ایسا شخص ایسی ہدایت کا اس طرح صراحت کردہ مدت کے اندر تعمیل نہیں کر پاتا ہے تو جائیداد کی قیمت کے برابر رقم اس سے ایسے وصول کی جا سکے گی جیسے وہ ایسی عدالت کے ذریعہ عائد کیا گیا جرمانہ ہو اور اس کی، حسب صورت، اس عورت یا اس کے وارثوں کو ادائیگی کی جا سکے گی۔

(4) اس دفعہ کی کسی بات کا دفعہ 3 یا دفعہ 4 کی توضیعات پر اثر نہیں پڑے گا۔

7- **جرائم کا اختیار سماعت:** (1) مجموعہ ضابطہ فوجداری، 1973 (1974 کا 2) میں کسی بات کے ہوتے ہوئے بھی،—

(الف) میٹرو پولیٹن مجسٹریٹ یا اول درجے کے عدالتی مجسٹریٹ کی عدالت سے کم درجے کی کوئی عدالت اس ایکٹ کے تحت کسی جرم کی سماعت نہیں کرے گی؛

(ب) کوئی عدالت اس ایکٹ کے تحت کسی جرم کی سماعت،—

(i) اپنی جانکاری یا ایسے جرم کو وجود میں لانے والے حقائق کی پولس رپورٹ پر، یا

(ii) جرم سے متاثر شخص یا ایسے شخص کے والدین یا دیگر رشتہ دار کے ذریعہ یا کسی تسلیم شدہ فلاحی ادارہ یا تنظیم کے ذریعہ کی گئی کسی شکایت پر، ہی کرے گا، نہ کہ دیگر طور پر؛

(ج) میٹرو پولیٹین مجسٹریٹ یا اول درجے کے عدالتی مجسٹریٹ کے لیے ایسا کرنا قانون کے مطابق ہوگا کہ وہ اس ایکٹ کے تحت کسی جرم کے لیے مجرم ٹھہرائے گئے کسی شخص کے خلاف ایسی سزا کا حکم صادر کرے، جس کا اس ایکٹ کے ذریعہ اختیار دیا گیا ہے۔

تشریح:—اس ذیلی دفعہ کے اغراض کے لیے تسلیم شدہ فلاحی ادارہ یا تنظیم سے کوئی ایسا سماجی فلاحی ادارہ یا تنظیم مراد ہے جسے اس ضمن میں مرکزی یا ریاستی حکومت نے تسلیم کیا ہے۔

(2) مجموعہ ضابطہ فوجداری، 1973 (1974 کا 2) کے باب 36 کی کوئی بات اس ایکٹ کے تحت مستوجب سزا کسی جرم کو لاگو نہیں ہوگی۔

(3) فی الوقت نافذ کسی قانون کے ہوتے ہوئے بھی، جرم سے متاثر شخص کے ذریعے دیے گئے بیان کی بنیاد پر اس کے خلاف مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔

8- **جرائم کا کچھ اغراض کے لیے قابل سماعت ہونا اور ناقابل ضمانت وناقابل مصالحت ہونا:** (1) مجموعہ ضابطہ فوجداری 1973 (1974 کا 2) اس ایکٹ کے تحت جرائم کو ویسے ہی لاگو ہوگی جیسے کہ وہ—

(الف) ایسے جرائم کی جانچ کی اغراض کے لیے، اور

(ب) مندرجہ ذیل سے مختلف معاملات کی اغراض کے لیے—

(i) اس مجموعے کی دفعہ 42 میں صراحت کردہ معاملات؛ اور

(ii) کسی شخص کی وارنٹ کے بغیر یا مجسٹریٹ کے کسی حکم کے بغیر گرفتاری، قابل سماعت جرم ہوں۔

(2) اس ایکٹ کے تحت ہر جرم ضمانتی اور ناقابل مصالحت ہوگا۔

8-**الف:** ایسے معاملوں میں جہاں کسی شخص کے خلاف دفعہ 4 کے تحت کوئی جہیز لینے یا لینے کی ترغیب دینے یا دفعہ 4 کے تحت جہیز مانگنے کے لیے کوئی مقدمہ چلایا جاتا ہے تو یہ بار ثبوت کہ اس نے ان دفعات کے تحت جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے اس شخص پر ہوگا۔

8-**ب ممانعت جہیز سے متعلق افسران:** (1) ریاستی حکومت ممانعت جہیز سے متعلق اتنے افسران مقرر کر سکتی ہے جتنی وہ مناسب سمجھے اور ساتھ میں ان علاقوں کی بھی صراحت کر سکتی ہے جن کی حدود میں وہ اس ایکٹ کے تحت اپنے اختیارات کا استعمال کر سکیں گے۔

(2) ہر ممانعت جہیز سے متعلق افسر مندرجہ ذیل اختیارات استعمال کرے گا اور فرائض منصبی انجام دے گا، یعنی:—

(الف) وہ دیکھے گا کہ اس ایکٹ کی توضیعات پر عمل کیا جا رہا ہے یا نہیں؛

(ب) جہیز لینے یا لینے کی ترغیب دینے یا جہیز کی مانگ کرنے جیسے معاملات کو جہاں تک ممکن ہو روکے گا؛

(ج) اس ایکٹ کے تحت جرائم کا ارتکاب کرنے والے افراد پر مقدمہ چلانے کے لیے ایسی شہادت یا ثبوت اکٹھے کرے گا جو ضروری ہوگی؛ اور

(د) ایسے دیگر کار ہائے منصبی انجام دے گا جو اسے ریاستی حکومت سونپے یا جن کی اس ایکٹ کے تحت بنائے گئے قواعد میں صراحت کی جائے۔

("خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم" قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

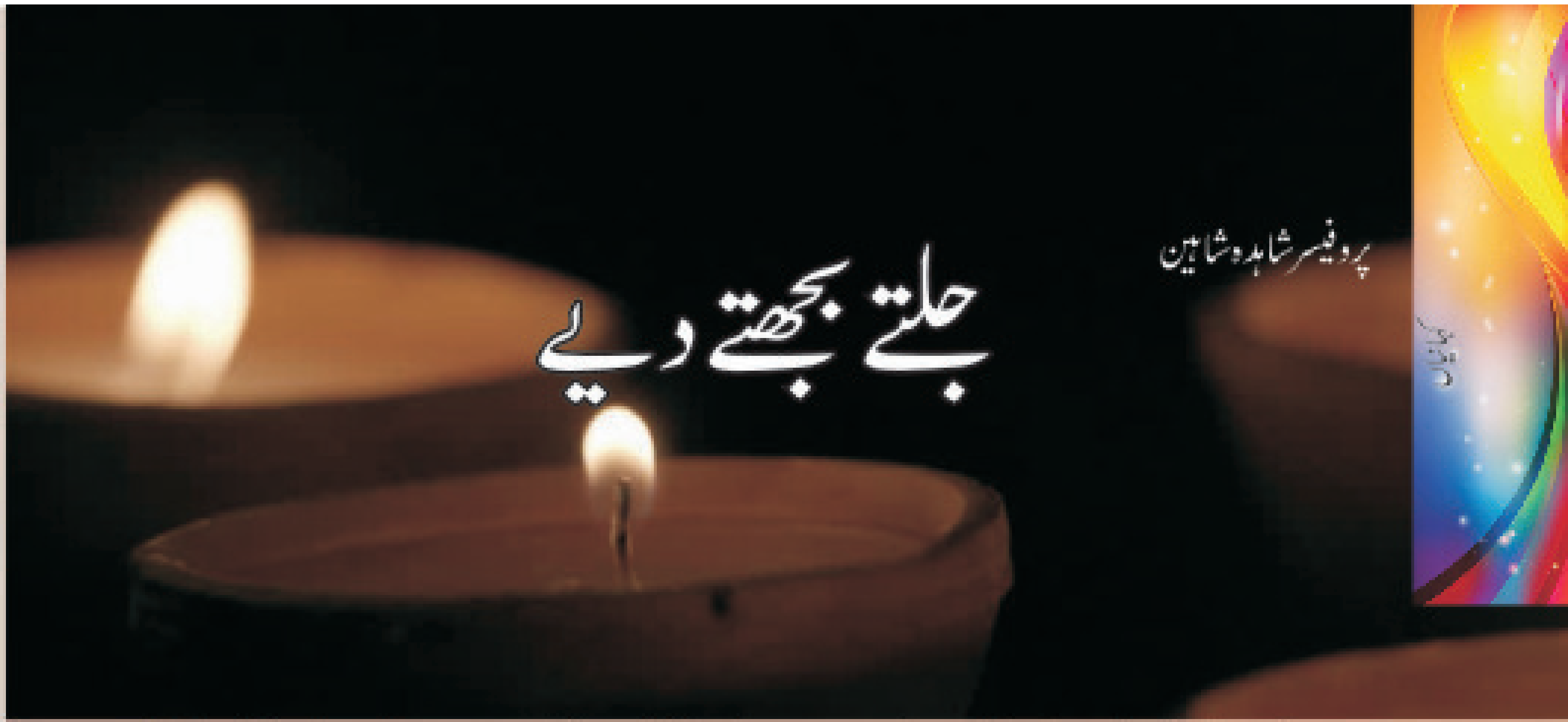

جلتے بجھتے دیے

پروفیسر شاہدہ شاہین

انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ میری گاڑی جس سمت گامزن ہے وہی میرا صحیح اور جائز مقام ہے کیونکہ مجھے احساس ہوگیا ہے کہ یہ وہ منزل ہے جو ازلی طور پر میرے مقدر میں لکھی جا چکی ہے.....

تقریباً دو ہفتے پہلے میں اپنی سسرال کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر میکے چلی آئی تھی کیونکہ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کہاں تک برداشت کرتی آخر۔ جب ایک لڑکی کے لیے اس کی سسرال میں مصائب و آلام اپنی حد پار کر جائیں اور زندگی بے حد مشکل لگنے لگے تو آخری پناہ گاہ اس کا اپنا میکہ ہی تو ہوتا ہے۔

میری امی نے اپنی گڑیا کو ایسی خانماں برباد حالت میں پا کر اپنی شفیق باہیں میرے لیے وا کر دیں، ابا نے بھی اپنا سر ہلاتے ہوئے میرے اقدام کو تسلیم کیا تھا۔ چھوٹی بہن زائرہ نے فوراً اپنے کمرے میں ایک اور بستر لگا دیا۔ میرا سامان بھی وہیں آس پاس رکھ دیا۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے فکر، کرب اور رنج والم کو دیکھ کر میرا اعتماد بحال ہوگیا کہ میں اتنی بھی لاچار نہیں ہوں۔ آبلہ پا اور تھکن سے چور میرے وجود کو مانو تپتے ہوئے صحرا میں ایک گھنے اور سایہ دار درخت کی چھاؤں نصیب ہوگئی تھی۔

چھوٹے سے کمرے میں دو عدد بستروں کے علاوہ ڈھیر سارے بیگ وغیرہ کے ہجوم میں واضح طور پر جگہ کی تنگی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اگلے دن سامان کو قرینے سے لگانے کا قصد کیا اور بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ ذہنی اور جسمانی طور پر میں اپنے آپ کو بے حد مضمحل محسوس کر رہی تھی مگر میری قسمت کی طرح نیند بھی مجھ سے منہ پھیر کر نہ جانے کہاں چھپ گئی تھی۔

اچانک تصور میں میری ننھی سی بیٹی سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ مجھے خیال آیا کہ جب وہ میرے کمرے میں آئے گی اور مجھے وہاں نہیں پا کر کیا کرے گی آخر ا ہمیشہ کی طرح ڈھیر ساری ٹافیاں، چوکلیٹ، کھلونے لے کر بہل جائے گی؟ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی.....کہیں وہ مجھے بھول تو نہیں جائے گی۔ پھر وہی ناچاری، مجبوری اور نارسائی کا احساس میری رگ و پے میں سرایت کرنے لگا.........

ملگجے اندھیرے میں کمرے کے در و دیوار کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں سوچنے لگی.......یہی وہ جگہ ہے جہاں میں نے اپنے مستقبل کے لئے رنگین خواب دیکھے تھے......ایک امیر و کبیر نوجوان سے شادی، پر تعیش زندگی، ڈھیر سارے گہنے خوبصورت ملبوسات، ولایت میں ہنی مون.......میرے سپنوں اور تمناؤں کی اونچی اڑان کو ملاحظہ کر کے علیم کی پرشوق آنکھوں میں ہمیشہ اداسی عود کر آتی۔ میرے بچپن کے ساتھی علیم کے ابو عظمت چچا اور میرے ابو دونوں ایک جیسے عہدے پر فائز تھے اور دونوں گھرانوں کے مالی حالات بالکل ایک جیسے تھے۔

پھر میری زندگی میں سچ مچ وہ دن آ گیا جب ایک کروڑ پتی گھرانے کے بے حد خوبرو نوجوان سے میرا رشتہ طے ہوگیا۔ ان کو صرف ایک خوبصورت اور خاندانی لڑکی کی تلاش تھی، ہماری پچھڑی ہوئی حالت پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لوگ میری قسمت پر عش عش کر رہے تھے اور اسے میرے بے مثال حسن کا کرشمہ گردانا جا رہا تھا۔

بارات والے دن علیم اچانک روپوش ہو گیا تھا اس دن مجھے ایک عجیب خلا سا محسوس ہوا۔ زندگی کے خوبصورت ترین لمحات میں ایک عزیز دوست کی غیر موجودگی بہت گراں گزری۔ میں اس سے جھگڑا کرنا چاہتی تھی پھر پتہ چلا تھا کہ اسے اچانک کسی خلیجی ملک سے نوکری کا بلاوہ آ گیا ہے۔ بے مروت کہیں کا......میری رخصتی کے موقع پر کم از کم اپنی نیک تمناؤں کی سوغات تو دے جاتا، نہ کچھ بتایا نہ کہا بس اچانک غائب ہو گیا۔

تصور میں وہ خوابناک لمحے در آئے جب میں دلہن بن کر اس گھر سے وداع ہوئی تھی۔ ایک عام لڑکی کی طرح میں بھی اپنی بے لوث وفاؤں کے ذریعے لامتناہی خوشیوں کی سوغات بانٹنے اور آنچل میں زندگی بھر کی شادمانیاں سمیٹ لینے کی امیدوں میں لے کر چلی تھی، برخلاف توقع اس گھر سے اگر کچھ ملا تو صرف بے رخی، تحقیر، مسلسل تڑپ، اور بے کراں تنہائی۔

اس گھرانے کے افراد کا رویہ اس قدر غیر معمولی، عجیب وغریب اور بے قاعدہ ہے کہ میں آج تک اپنے آپ کو اس ماحول سے ہم آہنگ نہیں کر پائی۔ وہاں انسانی جذبات کی کوئی قدر نہیں چہ جائیکہ کسی نادار ہستی کے احساسات کو اہمیت ووقعت عطا ہوتی۔ میں گنگ رہ جاتی جب میرا شوہر بنا کہے سنے وقت بے وقت اچانک غائب ہو جاتا۔ تنہائی کا زخم دل پر لیے رات رات بھر تڑپتی رہتی مگر کوئی بات پوچھنے بھی نہ آتا۔ فطری شرم وحیا کے مارے کسی سے استفسار کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ شوہر سے بھی نہیں۔

اسی کلفت اور انتشار کے عالم میں دیکھتے دیکھتے ایک سال نکل گیا اور میں ایک عدد خوب صورت سی گول مٹول بچی کی ماں بن گئی۔ سارے رنج وافکار کو پس پشت ڈال کر اپنی محرومیوں کا مداوا ممتا کے آنچل میں پالینا چاہا لیکن یہ حق بھی مجھ سے زبردستی چھین لیا گیا۔

میری آنکھیں اس منظر کو بھلائے نہیں بھولتیں جب آدھی رات کو اچانک میری آنکھ کھل جاتی ہے ...... دائیں پہلو سے شوہر اور بائیں پہلو میں سوئی ہوئی میری بچی دونوں ندارد ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور مجھے اندازہ ہے کہ دونوں اس وقت کہاں ہوں گے ...... ان کے پائے جانے کے متوقع ٹھکانہ کو سوچ کر میرا دل رشک وحسد اور نفرت سے بھر گیا ہے اور دونوں پہلو جل اٹھے ہیں۔ نیم روشن کمرے میں وسیع وعریض مسہری پر تنہا بیٹھی ہوئی سوچتی رہ جاتی ہوں کہ یہ میرے ساتھ آخر کیا ہو رہا ہے! اور میرا قصور کیا ہے؟ یہ ناقابل برداشت بے بسی اور بے کراں تنہائی کا احساس مجھے مار ڈالے گا...... لمبی فرانسیسی کھڑکی کے ذریعے دبیز پردوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی جلتے بجھتے قمقموں کی روشنیاں میرے دل کی دھڑکن سے تال ملاتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ آس کے ٹمٹماتے ہوئے ستارے اسی طرح میری زندگی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہیں گے؟ کیا کبھی سورج طلوع ہوگا! اچانک بچی کے رونے کی تیز آواز کانوں میں آتے ہی میں سب کچھ بھول جاتی ہوں فوراً مسہری سے اتر کر آواز کی سمت دوڑتے ہوئے بے تحاشا اس کمرے میں داخل ہو جاتی ہوں۔ توقع کے عین مطابق اپنی لختِ جگر اس کی دادی کے پہلو میں لیٹی ہوئی ہے۔ وہ بے خبر سو رہی ہیں اور وہ روئے جا رہی ہے۔ میں مضطرب ہو اٹھتی ہوں اور آگے بڑھ کر اپنی بچی کو باہوں میں اٹھا لیتی ہوں اور اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے آہستگی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل جاتی ہوں۔

اس خاندان میں پچھلی تین پشتوں سے صرف نرینہ اولاد ہی جنم لیتی رہی ہے۔ میری خوشدامن صاحب بھی پورے پانچ بیٹوں کی ماں ہیں لیکن صرف ایک کو چھوڑ باقی چار لڑکے کسی بیماری کا شکار ہو کر بچپن میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ برسوں سے اپنے دل میں ایک بیٹی کا ارمان لیے بیٹھی تھیں۔ پوتی کو دیکھتے ہی فوراً اٹھا کر گلے لگا لیا پھر انہوں نے یکلخت فراموش کر دیا کہ وہ بچی ان کے اپنے نہیں بلکہ کسی اور کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ صبح سے لے کر شام تک بچی کو اس طرح سینے سے لگائے رکھتیں جیسے وہ اس کی حقیقی ماں ہوں۔ صرف دودھ پلانے کے اوقات میں اسے میرے حوالے کیا جاتا۔ رات کو پتہ نہیں کب اسے میرے پہلو سے اٹھا لے جاتیں۔ میری بچی اپنی ماں کے بجائے دادی کے پہلو میں زیادہ پائی جانے لگی گویا میں صرف ایک دایہ بن کر رہ گئی تھی۔ میرے ارد گرد کوئی نہیں تھا جو آگے بڑھ کر اس ظلم کو روکے۔ جس کشتی کا ناخدا اسے منجدھار میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا ہو اس بے یار ومددگار کا پرسانِ حال کون ہو سکتا ہے بھلا۔

پورے گھر میں صرف ایک معمر ہستی ہے جو میرے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہے۔ اس نے بچپن میں ایک گورنس کے طور پر میرے شوہر کی دیکھ بھال کی تھی۔ وہ حسرت آمیز نگاہوں سے میرے چہرے کو تکتے ہوئے بولی:

''چلئے آج اس راز سے پردہ اٹھا ہی دوں جس کے نتیجے میں آپ کو اس گھر کی بہو بننے کا اتفاق حاصل ہو گیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شارب بابا کی پسند کوئی اور ہے لیکن اسے بہو کا درجہ دے کر گھر لانا ناممکن تھا۔ شدید بحث ومباحثے کے بعد ماں اور بیٹے کے درمیان ایک سمجھوتا ہو گیا کہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کی راہ میں روڑے اٹکائے بغیر اپنی اپنی مرضی پوری کرنے کے مجاز ہوں گے، اس طرح خاندان کی ناک کٹنے سے بچ جائے گی اور غیروں کو بھی نکتہ چینی کا موقع میسر نہیں ہوگا۔ آپ سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ اپنا منصب سنبھالتے ہوئے اس خاندان کی عزت وآبرو کو برقرار رکھیں اور شارب بابا اپنی جان جاناں کی آغوش میں اپنی کھوئی ہوئی محبت تلاشتے رہیں گے۔ بابا نے بہت مشکل سے سمجھوتا کیا ہے۔''

اس کی باتیں سن کر میں رنج اور حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ اب پتہ چلا کہ عمداً ایک غریب ونادار گھرانے سے بہو لانے کے پیچھے ان کا ارادہ کیا تھا اور آئے دن شارب اچانک کہاں غائب ہو جاتے

ہیں۔ میں ایک عجیب صورت حال سے دوچار ہوں۔ نہ شوہر میرا اپنا ہے نہ اپنی اولاد پر میرا بس چلتا ہے۔ میری بیٹی جب بھی میری طرف راغب ہونے لگتی ہے تو اس کی دادی ڈھیر ساری مٹھائیوں اور پھلوں کا لالچ دے کر اسے اٹھا لے جاتی ہیں۔ دن بھر ٹافی چوکلیٹ چباتے رہنا اس کی عادت بن چکی ہے۔ اگر میں منع کرتی ہوں تو رو رو کر پورا گھر سر پر اٹھا لیتی ہے۔ پھر دادی اس کے چونچلے پورا کرنے میں لگ جاتی ہیں جس کے نتیجے وہ بے حد ضدی اور خودسر ہوگئی ہے۔ مجھے اس کی بڑی فکر ہے۔

مجھے ہمیشہ اکیلے ہی مائکے جانا پڑتا ہے کیونکہ دادی اپنی پوتی کو دیکھے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتیں۔ ویسے دو ایک بار اسے اپنے ساتھ لے جانے کا خمیازہ بھگت چکی ہوں۔ اس کے مہنگے شوق کی وجہ سے میرے اپنے ابو امی کی جان آفت میں آگئی تھی۔ ان کی پریشانی کو ملاحظہ کرکے میں نے تہیہ کرلیا کہ وہ اسی گھر میں بھلی۔

ایک دن صبح سویرے طبیعت میں کچھ گرانی سی محسوس ہوئی، پچھلے تجربے کی بنا پر اندازہ ہوگیا کہ میں پھر سے ماں بننے والی ہوں...... یہ کسی کے پیار کی نشانی نہیں بلکہ حالات وحوادث کا ثمر تھا۔ قبل اس کے کہ کوئی تاڑ جائے میں یہاں سے فرار ہو جانا چاہتی تھی کیونکہ آپا کی زبانی اس سنگین حقیقت کا پتہ چل چکا تھا کہ جب پہلی بار میری گود ہری ہوئی تھی تو اس عورت نے کافی واویلا مچایا تھا پھر کئی دنوں تک اس کی طبی جانچ پڑتال اور علاج معالجے بھی چلتے رہے۔ آخر کار یہ راز افشا ہوا کہ وہ ماں بننے کے قابل ہی نہیں ہے۔ پھر یہ جان کر میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی کہ میرے شوہر نے اس کی ناکام تمناؤں کی تلافی میں اپنی ماں کی طرح اس کی بھی دیرینہ خواہش پوری کردینے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ خدوخال وجسمانی تغیر کے ساتھ ساتھ اسی فکر میں میری ذہنی حالت بھی عجیب ہو رہی تھی۔

انجام کار کسی کو اصلیت بتائے بغیر چلی آئی اس اعتماد کے بل پر کہ والدین پر بار گراں ثابت نہیں ہوؤں گی کیونکہ اتنی تعلیم یافتہ تو ہوں کہ کوئی چھوٹی موٹی سی نوکری کرکے اپنا اور ہونے والے بچے کا بوجھ اٹھانے کی متحمل ہو سکتی ہوں...... نہ جانے یہ میری خانماں بربادی کا افسوس تھا یا زمانے کی نگاہوں میں رسوائی کا خوف یا پھر ان کے اپنے گھریلو مسائل کے آگے میرے مشکلات خفیف سے لگے تھے کہ میری آمد کے ازاں بعد امی کی آنکھوں میں حزن وملال کے سائے گہرے ہوگئے تھے اور ابو کے کندھے کچھ اور جھک گئے تھے۔ مجھے ادراک ہونے لگا ہے کہ میرے نامساعد حالات کی اصلاح کرنا ان کی استطاعت کے دائرے سے باہر ہے اور مجھے یہاں آئے ہوئے اتنے دن گزر جانے کے باوجود ابھی تک میری حیثیت ایک مہمان کی سی ہے......خدارا! کوئی بتائے کہ یہ کیسا دستور ہے! جہاں پیدا ہوئی، پلی، بڑھی وہ آنگن میرے لیے قطعاً بیگانہ کیوں ہے؟

اچانک زائرہ نے کسمسا کر کروٹ بدلی تو احساس ہوا کہ وقت کافی گزر چکا ہے۔ کھڑکی سے باہر نظر ڈالی تو دیکھا کہ افق میں پو پھٹنے کے آثار نمودار ہو چکے ہیں۔ بند پلکوں میں مستقبل کے حسین خواب سمیٹے زائرہ سوتے میں کس قدر معصوم لگ رہی ہے۔ خواب جو کانچ کے نازک آبگینوں کے مانند ہوتے ہیں ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کر پاتے۔

میری غیر موجودگی میں خالہ نے زائرہ کو علیم کے لیے مانگ لیا تھا۔ اس بار وہ ولایت سے لوٹا تو مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک جاگ اٹھی اور میں اس کی باوقار شخصیت سے مرعوب ہوگئی۔ گرمی نظر کی تپش نے مجھے پگھلا دیا اور چند لمحوں کے لیے سب کچھ فراموش کرکے دور ماضی کی حسین اور رومان پرور یادوں میں کھو گئی۔ علیم بالکل بھول گیا تھا کہ کوئی ہے جس نے اس کے لیے گن گن کر ہجر کے لمحات گزارے ہیں اور بے چینی کے ساتھ اس کی نظر التفات کی متمنی ہے۔ میں نے غور کیا کہ اس طرح نظر انداز کیے جانے پر زائرہ کی آنکھوں میں جلتے ہوئے انتظار کے دیے مدھم پڑ گئے ہیں شرم وحیا کی لالی میں ڈوبا اس کا معصوم چہرہ بجھ کر رہ گیا ہے۔

میں اپنی بہن کو اس عذاب میں مبتلا کیسے دیکھ سکتی ہوں بھلا جبکہ اس کے درد وغم کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ میں نے اپنی سسرال فون کردیا ہے..... اس فیصلے کے پیچھے میرا تجاہل عارفانہ کارفرما ہے کہ اپنوں کے لیے ڈھیر سارے مسائل کا سرچشمہ ثابت ہونے کے بجائے صبر کا تلخ گھونٹ پی جانا بہتر ہے۔ کہتے ہیں حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے عین ممکن ہے کہ میری زندگی میں بڑا جان تلخی کو میرا صبر وتحمل امرت میں تبدیل کردے۔

صرف ایک گھنٹے کے اندر اندر شوفر سمیت ایک لمبی سی گاڑی دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی ہے۔ میرے اقدام پر ابو اور امی کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں چین واطمینان کے سائے اور میری آنکھوں میں میرے دیرینہ رفیق..... میرے آنسو پھر سے لوٹ آئے ہیں۔

Prof. Shahida Shaheen
371, 6th Cross,
opp. Nehru Park,
Udayagiri,
Mysuru-570019 (Karnataka)

بڑا حج

بنت سید مقبول حسین

ترکستان کے کسی گاؤں میں دو بوڑھے آدمی رہتے تھے ان میں سے ایک متمول تھا جس کا نام سلیم تھا دوسرا نسبتاً غریب تھا مگر وہ کسی کا محتاج نہ تھا۔ خدا نے اسے ذاتی ضروریات کے لیے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ اس کا نام عثمان تھا۔ سلیم سنجیدہ مزاج اور اپنی دھن کا پکا تھا۔ اسے منشیات سے نفرت تھی، کسی شخص نے اسے بدزبانی کرتے نہیں سنا وہ اپنے گاؤں کی پنچایت کا صدر تھا اور نہایت دیانتداری سے اپنے فرائض ادا کرتا تھا۔ اس کا بڑا کنبہ تھا اس کے دونوں لڑکے شادی شدہ تھے جو اس کے ساتھ ہی رہتے تھے، اس کی شرافت مسلم تھی لیکن وہ دنیاوی کاموں میں اتنا منہمک رہتا تھا کہ عبادت الٰہی کرتے وقت بھی اس کا دھیان اسی طرف لگا رہتا۔ عثمان جوانی کے ایام میں معماری کا کام کرتا تھا مگر جب سے وہ بوڑھا ہو گیا تھا اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی مگر شوقیہ اس نے شہد کی مکھیاں پال رکھی تھیں جن کا شہد بیچا کرتا تھا اس کا ایک لڑکا روزگار کی تلاش میں باہر گیا ہوا تھا اور دوسرا لڑکا گھر پر رہتا تھا جو اپنے باپ کا سہارا تھا۔ عثمان بہت ہنس مکھ تھا وفاداری کا مادہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، کبھی کبھی وہ تمباکو پیا کرتا تھا۔ البتہ نسوار کا بہت عادی تھا وہ اپنے ہمسایوں میں ہردلعزیز تھا کیونکہ وہ امن پسند تھا۔

ان دونوں بڈھوں نے مدت سے ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ اکٹھے حج کے لیے کبھی نہ کبھی ضرور جائیں گے، لیکن سلیم اپنے کاموں میں ہر وقت پھنسا رہتا تھا کوئی نہ کوئی کام اسے آئے دن ہو جاتا۔ ایک دن عثمان نے پوچھا' ابھی کوئی وقت مقرر کر دو تاکہ ہم حج کر کے اپنی عاقبت درست کریں، ہر سال اپنے ارادے ملتوی کرنا ٹھیک نہیں۔'

سلیم نے جواب دیا۔' تم جانتے ہو کہ میں نیا مکان بنوا رہا ہوں اس لیے میرے پاس کافی روپیہ نہیں ہے انشاءاللہ اگلے سال ضرور' عثمان نے کہا' ابھی اسی سال چلے چلو، تمہارا لڑکا مکان کی نگرانی کرتا رہے گا روپیہ تو ابھی تمہارے پاس کافی ہے۔ سلیم نے جواب دیا' نہیں میرا لڑکا شراب کا عادی ہے اس لیے مجھے ڈر ہے کہ وہ سب روپیہ اس میں اڑا دے گا' مختصر یہ کہ عثمان نے سلیم سے بہت کہنے سننے پر اس کو اسی سال حج میں چلنے کے لیے تیار کر لیا۔ آٹھ دس دن کے بعد یہ دونوں حج کو چلے۔ سلیم نے چلتے وقت اپنے لڑکے کو بہت نصیحت کی۔ لیکن عثمان نے صرف گھر والوں سے یہی کہا' جس طرح تم چاہو کرو۔' ایک دن وہ دونوں صبح کو چل دیے، راستے میں عثمان تمباکو نوشی کرتا جاتا تھا سلیم نے منع کیا لیکن عثمان نے یہی جواب دیا کہ' بھائی یہ عادت میرے اختیار سے باہر ہے۔'

گاؤں سے باہر نکلتے ہی عثمان خانگی معاملات کو بالکل بھول گیا لیکن سلیم کو ہر وقت اپنے مکان اور لڑکے کی بداخلاقی کی فکر تھی۔ ایک دفعہ تو سلیم نے ارادہ ہی کر لیا تھا کہ وہیں سے لوٹ جائے لیکن یہ خیال کر کے کہ گاؤں والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا ارادہ ملتوی کیا۔ غرض یہ دونوں اسی طرح 5 ہفتہ تک سفر کرتے رہے آخر کار وہ ایسے علاقہ میں پہنچے جہاں سخت قحط پڑ رہا تھا۔ متمول زمیندار بھی بھوکوں مر رہے تھے ایک دن وہ دوپہر کو ایک درخت کے نیچے آرام کر رہے تھے کہ عثمان کو پیاس لگی چنانچہ وہ سلیم سے یہ کہہ کر کہ وہ ابھی گاؤں سے پانی لاتا ہے چلا گیا۔ سلیم نے عثمان کا بہت انتظار کیا لیکن عثمان نہ آیا اور سلیم کو انتظار میں گھنٹوں گزر گئے۔ آخر کار سلیم یہ سوچ کر عثمان اس کو اگلی منزل پر مل جائے گا چل دیا۔ اب ادھر عثمان کا حال سنئے اس نے ایک نزدیک کے مکان پر جا کر دستک دی مگر کوئی

جواب نہ آیا۔ کیونکہ دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے اس نے اندر جھانک کر دیکھا تو ڈیوڑھی میں ایک آدمی پڑا ہوا تھا عثمان نے اس سے پانی مانگا لیکن اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ عثمان یہ خیال کر کے کہ وہ شخص یا تو بیمار ہے یا وہ اس کو فقیر سمجھ کر پانی دینا نہیں چاہتا لوٹنے ہی والا تھا کہ اس کو کسی بچے کی آواز آئی عثمان کو یقین ہو گیا کہ اس گھر پر کچھ بلا نازل ہوئی ہے چلو اندر چل کر دیکھیں جب وہ اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ چھوڑا تھا اور چھوٹا بچہ اس کا دامن کھینچ رہا تھا۔ گویا کچھ اس سے مانگ رہا ہے۔ دوسری طرف ایک اور عورت اوندھی پڑی تھی جس کے منہ سے بدبو آ رہی تھی اور وہ درد سے کراہ رہی تھی آخر کار بوڑھی عورت نے منہ اٹھا کر کہا' ہمارے پاس کچھ نہیں ہے تم کیا مانگتے ہو۔'

اجنبی نے کہا' مجھے پیاس لگی ہے۔ یا تو تھوڑا سا پانی دو یا کوئی گلاس'۔ عورت نے جوب دیا' نہ تو ہمارے پاس پانی ہے اور نہ کوئی برتن، مہربانی کر کے کسی اور گھر جاؤ'۔

عثمان نے دریافت کیا' تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اس عورت کی خبر گیری کر سکے دوسری عورت کی طرف اشارہ کر کے، عورت نے جواب دیا' کوئی نہیں میرا لڑکا باہر ڈیوڑھی پر جاں کنی کی حالت میں مبتلا ہے اور ہم یہاں بھوک سے مر رہے ہیں۔ اس اثنا میں چھوٹا لڑکا جو اجنبی کو دیکھ کر چپ ہو گیا تھا پھر چیخ اٹھا دادی اماں مجھے روٹی دو، او ہوں۔ روٹی' بوڑھی عورت اس بچے کو تسلی دے رہی تھی کہ اتنے میں گھر کا مالک جو ڈیوڑھی پر تڑپ رہا تھا اندر آ کر فرش پر گرا۔ اس کی زبانی عثمان کو معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ بھوک کی وجہ سے مر رہے ہیں، باپ سے اپنے لڑکے کی یہ حالت زار دیکھی نہ گئی وہ اسے دیکھ کر مایوسی سے رونے لگا۔ یہ تمام قصہ سن کر عثمان آبدیدہ ہو گیا۔ اس نے اپنا بقچہ کندھے سے اتارا اور اس میں سے روٹی نکال کر آدمی کو دینے لگا لیکن اس نے کہا کہ پہلے میرے بچوں کو دو۔ چنانچہ اس نے ان بچوں کو ٹکڑا دیا لیکن چونکہ ان کے حلق بالکل خشک تھے اس لیے لقمہ ان کے حلق میں اٹک رہا تھا پس عثمان بوڑھی عورت کے کہنے سے کنوئیں سے پانی لایا اور ان کے حلق تر کیے۔ بچے کھا پی کر سو گئے۔ جب مالک مکان نے کچھ کھایا اور باتیں کرنے کے قابل ہو گیا تو اس نے یوں کہنا شروع کیا' پہلے ہم اس گاؤں کے رئیس تھے۔ لیکن پانی نہ برسنے کی وجہ سے جب قحط پڑا تو ہم نے ایک جاڑا تو گزار دیا۔ پھر پڑوسیوں سے قرض مانگنا شروع اور پھر ہوتے ہوتے ہم نے اپنا کھیت تک رہن کر دیا۔ یہاں تک کہ ہماری حالت دن بدن سخت نازک ہوتی گئی اور اگر ہمیں ایک دن کھانا ملتا تو تین دن فاقے میں مست رہتے، اس طرح ہم اتنے کمزور اور نحیف ہو گئے، یہاں تک کہ ہم میں اٹھنے کی طاقت بھی نہ رہی اور اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے کہ خدا نے تم کو یہاں بھیجا۔'

عثمان نے ان کی یہ دردانگیز داستان سن کر ارادہ کر لیا کہ ایک رات ان کے یہاں قیام کرے تا کہ ان کی حتی المقدور مدد کر سکے۔ صبح کو اٹھ کر ان کے لیے اس نے ناشتہ تیار کیا۔ بازار سے اشیا خورد و نوش لایا۔ بیوی اور بال بچوں نے کھایا اور ان کے جان میں جان آئی۔ بیوی بھی اٹھ بیٹھی اور کام کاج کرنے لگی، مالک مکان ساہوکار کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اس اس دفعہ وہ اپنی زمین میں کاشت کرنے دے دوسری فصل میں زر رہن ادا کر دے گا لیکن ساہوکار نے یہ جواب دیا کہ جب تک روپیہ نہ دو گے تمہیں زمین پر قبضہ نہیں مل سکتا، مالک مکان نے یہ آ کر عثمان سے کہا۔ پہلے تو عثمان نے یہ سوچا کہ میں ان کے ساتھ بہت سلوک کر چکا ہوں اب مجھ کو اپنے سفر کے لیے روانہ ہونا چاہیے۔ رات بھر وہ اسی پر غور و خوض کرتا رہا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں نے ان کے ساتھ دو دن تک سلوک کیا ان کی ہر طرح کی مدد کی لیکن میرے چلے جانے کے بعد پھر ان پر پہلی سی حالت ہو جائے گی اس لیے ان کا کھیت واپس دلا دینا چاہیے، پس وہ صبح اٹھتے ہی ساہوکار کے پاس گیا اور اس کا تمام قرضہ بے باق کر کے زمین واپس لے لی اور ایک جوڑی بیلوں کی خرید دی اور چند غلے کی بوریاں اور ایندھن ان کے حوالے کر دیا۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ کھیت واپس مل گیا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی تمام گاؤں میں اس کا چرچا ہو گیا۔ ایک دن رات کو جب لوگ سو رہے تھے عثمان اٹھ کر چلا گیا۔ ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ اس نے اپنے روپے گنے تو اس کے پاس کل سترہ روپے نکلے، وہ یہ سوچ کر کہ اتنی قلیل رقم میں حج کسی طرح بھی ادا نہیں ہو سکتا گھر کو لوٹ گیا۔ گھر پہنچا تو لوگ متعجب ہوئے کہ وہ کیسے بغیر حج کیے لوٹ آیا لیکن عثمان یہی کہے گیا کہ خدا کی ایسی ہی مرضی تھی۔

اب ادھر سلیم کا حال سنئے وہ عثمان کا بہت انتظار کرنے کے بعد دوسری منزل کو روانہ ہوا۔ وہاں بھی نہ ملا تو سمجھا کہ وہ مجھ سے بہت آگے نکل گیا ہوگا اور مجھ کو خبر نہ ہوئی ہوگی۔ ہر مسافر سے وہ عثمان کی بابت پوچھتا لیکن کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دیتا، آخر وہ دمشق پہنچا پھر وہاں اس نے عثمان کا انتظار کیا لیکن بے سود۔ آخر سلیم ایک قافلے کے ساتھ مکہ روانہ ہو گیا حج کے ایام میں وہ عثمان کو بھول گیا۔ ایک دن وہ حجر اسود کے پاس بھیڑ چھٹنے کا انتظار کر رہے تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو بعینہ عثمان کی ہمشکل تھا۔ وہ شخص حجر اسود کو بوسہ دے کر باہر نکل رہا تھا۔ جب اس نے

غور سے دیکھا تو وہ ہی اس کا دوست تھا، وہ اس کی تاک میں رہا کہ جب وہ باہر نکلے گا ضرور اس سے ملاقات کروں گا لیکن جب وہ انبوہ میں شامل ہو گیا تو پھر وہ اس کو ڈھونڈ نہ سکا، سلیم کو تعجب تھا کہ وہ کیسے وہاں تک پہنچا۔ حالانکہ میں نے راستے میں بہت تلاش کی، ایک دن پھر سلیم نے اس کو مسجد نبوی میں دیکھا تو اس کا چہرہ بڑا چمکتا تھا اس نے پھر اپنے ساتھی کا انتظار دروازے پر کیا۔ تمام لوگ ایک ایک کر کے نکل گئے لیکن وہ نہ نکلا۔ آخر کار سلیم تھک کر گھر لوٹ آیا اس کو ہمیشہ گھر کا فکر رہتا تھا کہ کہیں لڑکے نے تمام مال و جائداد برباد نہ کر دی ہو اس لیے اس کو ایک منٹ بھی چین نہ ملتا تھا۔

سلیم واپسی پر اسی راستے سے آیا۔ جب وہ اس مقام پر پہنچا جہاں عثمان اس سے جدا ہوا تھا تو وہ اس گاؤں کے لوگوں کی حالت دیکھ کر تحت حیران ہوا کیونکہ وہ اب بڑے فارغ البال نظر آتے تھے۔ ان کے کھیت لہلہا رہے تھے جب وہ اس گاؤں میں داخل ہوا تو ایک چھوٹی لڑکی نے کہا کہ آؤ بابا ہمارے گھر چلو۔ پہلے تو سلیم نے اپنا پیچھا چھوڑانا چاہا پھر آخر کو مجبور ہو کر اس کے گھر گیا جب گھر گیا تو ایک عورت نے خوش آمدید کہا۔ گھر کی مالکہ نے اس کا بچا اتارا اور اس کی خاطر تواضع کی۔ سلیم نے اس کی صلے میں ان کے لیے دعا مانگی پھر اس عورت نے کہا تمھاری وضع قطع کا ایک شخص کچھ دن ہوئے ہمارے یہاں آیا تھا جبکہ ہم قحط کی وجہ سے موت کا شکار ہو رہے تھے اس نے جو ہمارے ساتھ مہربانی کی اس کو عمر بھر نہ بھولیں گے اس ہمدردی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب ہم فارغ البال نظر آ رہے ہیں۔' رات کو سلیم انھیں کے یہاں رہا اور یہ سوچتا رہا کہ حج کے ایام میں اس نے عثمان کو تین مرتبہ دیکھا تھا اس کو یقین ہو گیا کہ خداوند تعالیٰ نے میرے حج قبول کو قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ مگر عثمان کا حج یقیناً قبول ہو گیا۔ دوسری صبح کو وہ وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔

سلیم پورے ایک سال کے بعد جب اپنے گھر واپس آیا تو اس کا لڑکا موجود نہ تھا، کسی نے بتایا کہ شراب خانہ گیا ہوگا۔ جب تھوڑی دیر میں وہ لوٹا تو نشہ میں چور تھا۔ سلیم نے اس سے اپنی جائداد کے بارے میں پوچھا تو اس کو وہی جواب ملا جس کی اس کو فکر رہتی تھی۔ دوسری صبح کو عثمان کی بیوی سلیم سے گلی میں ملی اور حج کے بارے میں تمام باتیں پوچھتی رہی۔ سلیم نے دریافت کیا کہ عثمان گھر ہی پر موجود ہے یا نہیں؟ اس نے کہا کہ ہاں چنانچہ سلیم اس کے ساتھ عثمان کے گھر روانہ ہوا جب سلیم گھر میں داخل ہوا تو عثمان کو شہد میں مشغول پایا اس کا نورانی چہرہ چمک رہا تھا سلیم نے عثمان سے کہا کہ وہ لوٹتے وقت اسی گاؤں میں ٹھہرا تھا اور پھر پورا حال بتایا۔ عثمان نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔' اللہ کی مرضی یہی تھی۔ آؤ اندر بیٹھیں۔ میں تمھیں شہد کھلاؤں۔' غرض عثمان اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا، سلیم تاڑ گیا کہ وہ اس موضوع پر کچھ سننا نہیں چاہتا چنانچہ وہ خاموش ہو گیا اس نے یہ بھی نہ بتایا کہ اس نے حج کے ایام میں اس کو دیکھا تھا مگر اب اس کو معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کی سب سے بڑی عبادت یہی ہے کہ جب تک انسان زندہ رہے وہ دوسروں کے ساتھ نیکی کرے اور ان سے محبت بھی کرے یہی بڑا حج ہے۔ (ماخوذ از ٹالسٹائی، عصمت، جون 1932)

فرہنگ آصفیہ سے

بطلیموس - یونانی۔ اسم مذکر۔ یہ شخص مصر کا ایک مشہور مہندس ہے دوم صدی مسیحی میں موجود تھا۔ ۷۸ برس کی عمر پائی اور اسی صدی میں مر گیا۔ بعض مؤرخوں نے اسے جالینوس کا شاگرد اور مصر کا بادشاہ بھی قرار دیا ہے علم نجوم و ہندسہ میں بہت کچھ درک رکھتا تھا۔ چنانچہ اس فن میں اس نے کتابیں بھی لکھیں ہیں جنمیں سے کتاب ماغا طیسی یا ماغا الطن بمعنی عظیم جسے اہل عرب مجسطی کہتے ہیں بعض طبیہ مدارس میں اب تک پڑھائی جاتی ہے۔ اس کا مولد اسکندریہ واقع مصر ہے۔ سلطان ورزیانوس کے عہد سلطنت میں اس نے ایک رصد خانہ بھی بناڈالا تھا۔ اس حکیم نے علم جغرافیہ کی ترتیب میں بڑی محنت کی ہے۔ اس کا ترتیب دیا ہوا نقشۂ ارض ابھی تک موجود ہے۔ مگر اس کی زیادہ شہرت نظام بطلیموس کیوجہ سے ہوئی اور تمام حکمائے اہل اسلام اس اجتہاد کے پیرو ہو گئے۔ یہاں تک کہ مفسرین نے بھی قرآن مجید کی ان آیتوں میں جن میں ارض و سما کا ذکر تھا کھینچ تان کر اسی کی مطابقت پر لاڈالا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو مذہب فیثاغورس اور کوپرنیکس کی مطابقت سے بھی انہیں آیات ربانیہ کی تفسیر ممکن تھی۔ اس امر میں مذہب بطلیموس سر اسر غلط اور غیر متحقق ہے کیونکہ اس نے زمین کو ایک چھوٹے سے سیارے کو مرکزِ عالم قرار دے کر تمام اجرام فلکیہ کو اس کے گرد چکر کھانا یقینی مانا ہے۔ اگر یہی تحقیقات صحیح مانی جائے تو عام قوانین الٰہی پر ایک بھاری اعتراض آئے جو نہایت ہی غیرت کا باعث ہو۔ باوجود کہ اس سے تھوڑے ہی عرصہ پیشتر فیثاغورس اس مسئلہ کو بخوبی حل کر گیا تھا مگر اس خدا کے بندے نے محض بہ نظر اجتہاد جدّت اس سے انحراف کر کے ایشیائی عالم کو مغالطہ میں ڈال دیا۔ یہ شخص خوش پوشاک، شیریں کلام اور شدید الغضب و کینہ توز تھا۔ جس سے ایک دفعہ بگڑ جاتا کبھی اصلاح نہ ہوتا۔ عطر اکثر ملا کرتا اور روزے بہت رکھا کرتا تھا۔

بے زبان لڑکی

مسرت جہاں

صابرہ اسم بامسمٰی تھی، کیونکہ ہر مصیبت میں صبر کرنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ پھر چاہے گھر کے کام کاج میں اضافہ ہو یا دن بھر سخت محنت کے بعد رات فاقے سے گزارنی پڑے یا امتحان میں سخت محنت کے باوجود ناکامی ہاتھ آئے یا رشتے کی بات درمیان میں ہی ٹوٹ جائے یا پھر ناکامیوں اور مایوسیوں سے پتھرائی ہوئی آنکھیں تمام رات بے خواب رہیں۔ مزید یہ کہ اس کے ماں باپ بڑھاپے کو پہنچ چکے تھے، لیکن وہ صابرہ کے لیے ابھی تک کچھ بھی نہ کر پائے۔ وہ آسمان کی جانب اپنی مایوس نگاہوں سے تکتے رہتے۔ اب تو وہ زندگی سے بھی عاجز ہو چکے تھے۔ لیکن سانس یوں اٹکی رہی کہ کسی طور صابرہ وداع ہو جائے۔

آخر ایک دن شبنم آئیں وہ رشتوں کے توڑ جوڑ میں بڑی شاطر سمجھی جاتی تھیں۔ انہوں نے صابرہ کے لیے ایک رشتہ تجویز کیا کہ لڑکا عدالت میں اہلکار ہے۔ اچھی یافت ہے اور ذمہ داریاں نہیں کے برابر ہیں، رہن کے مکان میں رہتا ہے۔ اور کوئی مطالبہ قطعی نہیں ہے۔ اور کیا چاہیے۔ صابرہ کے والدین کی سوچ بچار کی صلاحیتیں ماؤف ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بنا سوچے سمجھے ہاں کہہ دی۔ لڑکے کا نام تک نہ دریافت کر سکے۔

صابرہ کی جیسے تیسے شادی ہو گئی۔ شادی کی رات شوہر کو دیکھا تو پستہ قد، مائل بہ فربہی، پختہ عمر کا سانولا سا آدمی تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ اونچا سنتے تھے۔ راز کی بات کہہ نہیں سکتے اور سنتے لفظ لفظ نون غنہ، ناک میں ڈوبا ہوا، غنغناتی آواز ایسی جیسے لاتعداد مکھیاں ایک ساتھ بھنبھنا رہی ہوں۔ ایسی حالت میں سہاگ رات کی بدمزگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال زیادہ غیبت بھی ٹھیک نہیں، پر اتنی اطلاع تو دینی ہی ہوگی کہ ان کا نام تو رشید تھا، مگر سب راشو بھائی کہتے تھے۔ ملازمت کے متعلق معلوم ہوا کہ کسی وکیل کے پاس معمولی تنخواہ پر ملازم ہیں۔ دونوں میں کوئی Match نہ تھا۔ لیکن صابرہ کرتی بھی کیا، مقسوم پر صبر کر کے بیٹھ رہی۔

چند دن بعد مالک مکان آدھمکا اور چھ ماہ کا کرایہ کوئی تیس ہزار روپیہ کا مطالبہ کر بیٹھا اور ایک ماہ میں مکان خالی کرنے کی نوٹس بھی دے گیا۔ رشید نے صابرہ سے کہا کہ وہ اپنے والدین سے مطلوبہ رقم لے آئے ورنہ صورت نہ دکھائے۔ صابرہ اپنے گھر تو گئی، لیکن وہاں تالا لگا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ والدین چل بسے، جس کی اطلاع صابرہ کو بروقت نہ ہو سکی۔ اسے وہاں بھی صبر سے کام لینا پڑا۔ اس کے بعد نہ تو کسی نے اسے بلایا اور نہ وہ جا سکی۔ پاس پڑوس میں دو چار گھر کام کر کے اپنا گزارہ کرنے لگی۔ وہ حاملہ تھی۔ اس لیے بھی کام کرنا اس کی مجبوری تھی۔ ایک دن رشید اس کے گھر آیا اور طلاق کے تین پتھر پھینک کر چلدیا۔ اس دن وہ دیر تک اپنی بے بسی پر روتی رہی پھر آنسو پی کر حسب معمول صبر کر لیا۔

دوسرے دن شام کے وقت اس کے جان پہچان کی ایک بیوہ پنکی بی آئی اور پوچھا کہ کیا وہ بڑے گھر میں کام کرنا پسند کرے گی؟ وہاں صرف ایک ماں اور دو بچے ہیں۔ ان کے گھر والے دبئی میں کام کرتے ہیں۔ اچھی تنخواہ دینگے۔ تجھے آرام رہے گا۔ صابرہ نے حامی بھر لی اور دوسرے دن صبح آنے کا وعدہ کیا۔

حسب وعدہ وہ دوسرے دن پنکی بی کے ہمراہ بڑے گھر پہنچی۔ بی بی صاحبہ نے اسے گھر کا کام سمجھایا اور اس کی توقع سے زیادہ تنخواہ کی پیشکش کی جسے اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ بی بی صاحبہ نے یہ بھی بتایا کہ مکان میں خادمہ کا کمرہ بھی موجود ہے، وہ چاہے تو اُس میں رہ سکتی ہے۔ دوسرے خدمت گار اس سہولت کا فائدہ نہیں اٹھاتے تھے کیونکہ وہ

اپنے کنبہ سے الگ رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ انہیں خدشہ رہتا تھا کہ ان سے وقت بے وقت خدمت لی جاسکتی تھی۔ اس لیے وہ اپنے آرام اور پرائیویسی میں مداخلت بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ صابرہ نے کمرہ کے لیے منع تو نہیں کیا، لیکن کہا کہ وہ بعد میں اس بارے میں بات کرے گی۔

اسے کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ بیت گیا تھا۔ بی بی صاحبہ اس کے کھانے پینے کا بھرپور خیال رکھتیں۔ ایک رات موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ صابرہ کے بوسیدہ مکان کی چھت ٹپکنے لگی، یہاں تک کہ اسے کھڑا رہنا بھی دشوار ہوگیا۔ آدھی رات کو وہ طوفانی بارش میں بھیگتی بھاگتی بی بی صاحبہ کے پاس پہنچی۔ انہوں نے فوراً اس کے کپڑے بدلوائے اور خادمہ کے کمرے میں آرام کرنے کے لیے کہا۔ کمرہ بڑا آرام دہ تھا۔ ضرورت کی ہر چیز اس میں موجود تھی۔ مسلسل مصیبتوں کے بعد قدرت اس پر کسی قدر مہربان نظر آرہی تھی۔

اس کے آبائی مکان پر کچھ لوگ قابض ہونے کے لیے کوشاں تھے۔ اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ اسے فروخت کرکے رقم کسی بینک میں محفوظ کردی جائے۔ اس نے مکان فروخت تو کردیا، لیکن اس رقم سے سونا خرید کر اسے محفوظ کردیا تاکہ روپیہ کی قدر میں کمی بیشی اس پر اثر انداز نہ ہو پائے اور وہ اپنے بچے کی پرورش و پرداخت شادی بیاہ پُرسکون انداز میں کر پائے۔

نادیہ بی بی صابرہ کے کام سے بہت مطمئن تھیں کیونکہ وہ گھر کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیکر بچوں کے ہوم ورک کرنے میں مدد کرنے کے علاوہ مشکل اسباق سمجھا دیا کرتی تھی۔ دن گزرتے گئے۔ نادیہ میڈم اسے قریبی میٹرنٹی ہوم میں لے گئیں اور چیک اپ کے بعد لے آئیں۔ اس کا رجسٹریشن بھی اسی میٹرنٹی ہوم میں کردیا گیا کیونکہ وہاں قابل اور تجربہ کار لیڈی ڈاکٹروں کی ہمہ وقت نگرانی رہتی تھی۔ چند ماہ بعد اسی میٹرنٹی ہوم میں صابرہ کی نارمل ڈلیوری ہوئی۔ اس نے ایک لڑکی کو جنم دیا۔ کچھ دن تو دونوں ڈاکٹروں کی راست نگرانی میں رہے۔ ڈاکٹر آپس میں اس کیس کے متعلق گفتگو بھی کرتے رہتے تھے۔ جسے سن کر صابرہ جان گئی کہ وہ نوزائیدہ کی سماعت کی جانچ کرنا چاہتے ہیں جس میں نرخرہ، نطقی جھلیاں، پھیپھڑے، دہن، زبان اور بروکائی حصہ (Broca's area) شامل ہیں۔ یہ تمام ٹیسٹ کیے گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے زچہ سے چند سوالات کیے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ نے بچی کا نام کیا رکھا ہے۔ صابرہ نے جواب دیا کہ ہم اسے نوری کہنا چاہتے ہیں، جو فارم میں درج کردیا گیا۔ پھر والد کا نام پوچھا وہ بتا دیا گیا۔ پھر پوچھا گیا کیا آپ کو بات کرنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔ صابرہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔ کیا بچی کے والد کو بات کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ جی ہاں۔ وہ ناک میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ انہیں اور کوئی شکایت؟ جی ہاں، انہیں ثقل سماعت کی شکایت بھی ہے۔ تب ڈاکٹروں نے کہا کہ آپ وقفہ وقفہ اور پابندی سے یہاں اس کی جانچ کراتے رہیں۔ ڈاکٹروں کی جانچ پڑتال کے بعد صابرہ نے پرخوف انداز میں دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے؟ بچی کی جان کو کوئی خطرہ تو نہیں۔ ڈاکٹر نے کہا نہیں نہیں، ماشاءاللہ بچی صحت مند ہے، بس ذرا بات کرنے میں اسے دشواری پیش آسکتی ہے اس لیے پابندی سے اس کی جانچ کراتے رہیں۔ یہ سن کر صابرہ کا دل بیٹھ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ بچی گونگی پیدا ہوئی ہے۔ تب تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ تقدیر قدم قدم پر اس کے صبر کا امتحان لے رہی ہے۔ نادیہ نے اسے سینہ سے لگا کر دلاسہ دیا اور بڑی مشکل سے اسے چپ کرا سکی اور گھر لے آئی۔

اس دوران صادق کو دبئی گئے ہوئے چھ ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ ویسے تو بیوی بچوں سے ان کی بات چیت موبائیل اور ویڈیو کالنگ کے ذریعہ ہوا کرتی تھی، پر روبرو ملاقات کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ چنانچہ نادیہ نے ان پر زور دیا کہ بچے آپ کو بہت مس کررہے ہیں اور بہت یاد بھی کررہے ہیں، اس لیے آپ بلاتاخیر چلے آئیں۔ یہ تو بچوں کی بات ہوئی، صادق نے پوچھا آپ کی کیا کیفیت ہے؟ نادیہ نے مصنوعی غصہ سے جواب دیا دیکھیں اب ٹال مٹول کی بات نہ کریں ورنہ ہم سب وہاں آ دھمکیں گے۔ صادق نے کہا کہ الیکٹرانک انجینئر ہونے کی وجہ سے مجھ پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہیں، خیر میں یہاں کوئی عارضی بندوبست کرکے جلد ہی آجاتا ہوں، فکر نہ کریں۔ اور واقعی وہ ایک ہی دو روز میں گھر آپہنچے۔ صادق کی آمد سے گھر کی رونق دوبالا ہوگئی۔ صابرہ نے جائزہ لیا کہ وہ ایک وجیہ اور دلکش شخصیت کے مالک ہیں اور بات چیت سے بھی قابلیت اور شائستگی جھلکتی ہے۔ صابرہ نے اس فیملی کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، جس کی وجہ سے اس کی وقعت اور بھی بڑھ گئی۔ صادق نے دیکھا کہ اس کا چہرہ محض پریشانیوں کی وجہ سے کملایا ہوا ہے، ورنہ وہ ایک قبول صورت، دراز قد اور شائستہ خاتون ہے۔

صادق اپنی فیملی کے ساتھ ہفتہ عشرہ انجوائے کررہے تھے کہ ان کے سسرال سے سالے صاحب کا فون آیا کہ صادق کی سب سے چھوٹی سالی کی شادی اچانک طے ہوگئی ہے بس آنے والی جمعرات کو عقد قرار پایا ہے کیونکہ شادی کے فوری بعد دلہا دلہن کینیڈا روانہ ہونے والے ہیں، کیونکہ دلہا وہاں کے کسی اسپتال میں ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ چنانچہ یہ فیملی بھاگم

بھاگ صادق صاحب کے سسرال پہنچ گئی۔ اور جب صادق اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ واپس ہوئے تو ان کے ساتھ نادیہ نہ تھیں۔ صابرہ نے ان کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ اچانک ہارٹ اٹیک جان لیوا ثابت ہوا۔ صابرہ تو یہ خبر سن کر حواس باختہ ہوگئی۔ جہاں بھی اس کا سایہ پڑتا وہاں بربادی لازمی تھی۔

اب اسے یہ تشویش لاحق تھی کہ اگر یہاں سے جواب مل جائے تو وہ کہاں جائے۔ کہاں ٹھہرے۔ کیا کرے۔ نظروں کے سامنے حد نظر تک گویا ایک ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ چند ہفتے اسی ادھیڑ بُن میں بیت گئے۔ آخر ایک دن صبح سویرے صادق اس کے کمرے میں نمودار ہوئے۔ صابرہ کا خیال تھا کہ شاید وہ نوکری سے علیحدگی کی اطلاع دینے کے لیے آئے ہیں۔ چنانچہ اس نے پہل کرتے ہوئے کہا کہ آج میں اپنا سامان سمیٹ لوں تو شام تک روانہ ہو جاؤں گی لیکن صادق نے کہا شاید اس کی نوبت نہ آئے، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو اس فیملی میں ہمیشہ کے لیے شامل کرنے کی تجویز لے کر آیا ہوں۔ یہ سن کر صابرہ دنگ رہ گئی۔ اس نے اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا کہ نہ جانے بچوں کا کیا ردعمل ہو۔ وہ مثبت ہی ہوگا، صادق نے مزید کہا وہ آپ کو بے حد چاہتے ہیں۔ اس طرح سہم سہم کر صابرہ اس نئے رشتے سے منسلک ہوگئی۔

دن مہینوں اور برسوں میں بدل گئے اور پھر کچھ برس بھی بیت گئے۔ اس دوران صابرہ مزید دو بیٹوں کی ماں بن گئی۔ نوری نے گونگوں اور بہروں کے مدرسوں میں اپنی تعلیم جاری رکھی اور وہ میٹرک کے قریب پہنچ گئی۔ ادھر صادق نے بھی اپنی ملازمت ترک کر کے یہیں کاروبار شروع کیا مگر اس میں انہیں نقصان ہی برداشت کرنا پڑا، کیونکہ انھیں تجارت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ پے در پے کاروباری ناکامیوں اور مسلسل مالی نقصانات سے وہ جھنجلا گئے تھے، ادھر ان کے بچوں کے تعلیمی اخراجات میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ان کا بڑا لڑکا میڈیکل میں داخل ہونے جارہا تھا، جس کے لیے انھیں لاکھوں روپیہ کے اخراجات برداشت کرنے تھے۔ اسی دوران نوری کے پرنسپل کا فون صادق صاحب کے نام آیا کہ وہ اسکول آکر ملاقات کرلیں، چنانچہ وہ اسی روز دوپہر پرنسپل کے آفس پہنچے۔ اپنے تعارف کے بعد انہوں نے ملاقات اور موضوع سے متعلق استفسار کیا تو پرنسپل نے بتایا کہ آپ نے اپنا نام صادق بتایا ہے جبکہ والد کے کالم میں لڑکی کے والد کا نام کچھ اور ہی درج ہے۔ آپ کا لڑکی سے کیا رشتہ ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ میری سوتیلی لڑکی ہے اور میں اس کا گارجین یا اب اس کا فادر ہوں۔ پرنسپل نے کہا کہ گویا اب ہم آپ سے فیس کے ساتھ ساتھ دیگر اخراجات کی بھی درخواست کرسکتے ہیں۔ چونکہ آپ این آر آئی رہ چکے ہیں اور اب شہر میں آپ کا عظیم الشان کاروبار بھی ہے اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اپنی لڑکی کی فیس کے ساتھ ساتھ اس اسکول کی امداد کے لیے کم از کم پچاس ہزار تو دے ہی سکتے ہیں۔ صادق صاحب نے نرم لہجہ میں کہا کہ سر دست آپ فیس ہی وصول کرلیں، امداد کے متعلق تو بعد میں بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ یہ سن کر پرنسپل کا چہرہ کچھ کھنچ گیا اور انہوں نے کسی قدر درشت لہجہ میں کہا کہ ٹھیک ہے آپ فیس آفس میں جمع کرادیں۔ اس ملاقات کے بعد ظاہر ہے کہ صادق صاحب کا موڈ خراب ہوگیا اور گھر آتے ہی وہ صابرہ پر برس پڑے۔ پھر یہ چپقلش بڑھتی ہی گئی۔ چنانچہ ایک دن ڈنر کے دوران صادق صاحب نے پوچھا بھئی صابرہ آج سالن کس نے تیار کیا ہے، صابرہ سمجھیں شاید وہ تعریف کرنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھ کر فوراً کہا کہ نوری نے تیار کیا ہے۔ یہ سن کر صادق نے ڈپٹ کر کہا کہ تب تو اس نے سارا ہی نمک جھونک دیا ہوگا۔ صابرہ نے سالن چکھ کر کہا نمک زائد تو نہیں ہے۔ اتنا تو ہونا ہی چاہیے۔ تو ٹھیک ہے تم دونوں کھاتی رہو ہم کہیں اور جاکر کھا لیتے ہیں۔ وہ رات صابرہ نے رو کر گزار دی۔ پھر ایسی وارداتیں آئے دن ہونے لگیں۔ صادق نوری کے ساتھ دشمن جیسا سلوک روا رکھنے لگے۔ صابرہ اس برتاؤ سے تنگ آچکی تھی۔ ایک دن اس نے صادق کا نارمل موڈ دیکھ کر ان سے پوچھ ہی لیا کہ اگر ہم ماں بیٹی سے آپ کو کچھ پریشانی لاحق ہو تو ہم آپ سے وداع لینا چاہیں گے۔ اس بات پر صادق جھنجلا گئے۔ تمہاری یہ حرکت میرے لیے مزید پریشانی کا باعث ہوگی، کچھ سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔

اس دن پھر نوری کے اسکول سے صادق کو بلاوا آیا۔ انہوں نے اس بار صابرہ کو بھی ساتھ لیا۔ پرنسپل کے چیمبر میں نوری کے ساتھ ایک اور لڑکا بھی کھڑا تھا۔ نوری کی کلاس ٹیچر بھی موجود تھیں۔ پرنسپل نے بات کی ابتداء کرتے ہوئے کہا کہ نوری اور ان کے ساتھ کھڑے ہوئے لڑکے کا نام عبدالسمیع ہے۔ دونوں اپنی جماعت کے سب سے ذہین طالب علم ہیں اور ادھر چند دنوں سے ان کے متعلق کچھ اطلاعات گشت کررہی ہیں کہ دونوں کلاس میں ایک ہی بنچ پر ساتھ ساتھ بیٹھتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں بھی ساتھ رہتے ہیں۔ اسکول کے باغ میں ساتھ ٹہلتے ہیں اور اسکول چھوٹنے پر ساتھ ہی روانہ ہوتے ہیں۔ یہ حرکتیں جہاں دوسرے طلبہ پر غلط اثر ڈالتی ہیں وہیں اسکول کے انتظامیہ کے لیے بھی ایک مسئلہ بن گئے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنی لڑکی کی ٹی سی لے کر کسی دوسرے اسکول میں داخلہ لے لیں۔ ہم نے لڑکے کے والدین سے بھی صبح یہی معاملہ ڈسکس کیا ان کا کل تک جواب آجائے گا۔ صادق نے تیز نظروں سے صابرہ کی جانب دیکھا۔

اس نے سر جھکالیا۔ میٹنگ کے شرکاء کے اشاروں اور چہرے پر غصہ اور ناراضگی کو دیکھ کر بچوں نے معاملہ کی نزاکت اور سنجیدگی کو محسوس کر لیا تھا کہ ان کے متعلق کوئی سخت فیصلہ ہونے والا ہے جس سے ان کے والدین کو سخت شرمندگی اور ذلت کا سامنا ہوگا۔ یہ سوچ کر دونوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور خاموشی سے چل دیے۔ کچھ دیر بعد جب ان کی غیر موجودگی کا سب کو احساس ہوا تو صادق پریشان ہو کر انھیں تلاش کرنے لگے کہ اتنے میں کسی نے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کر کے بتایا کہ غالباً وہ چھت پر گئے ہیں۔ صادق تیزی سے چھت کی جانب دوڑے۔ اسکول کی عمارت بلند تھی اور اس کے عقب میں لکڑی چیرنے کا کارخانہ تھا۔ وہاں لکڑی کے بھس کا ڈھیر جمع رہتا تھا لیکن ان تمام باتوں سے بے خبر دونوں نے بلند بلڈنگ سے ایک ساتھ چھلانگ لگا دی مگر بھس کے ڈھیر میں جا گرے اور اسی وقت صادق چھت پر چڑھ کر اس کنارے سے جھانکنے لگے جہاں بچوں نے چھلانگ لگائی تھی لیکن نیچے سے نظارہ کرنے والوں نے سمجھا کہ صادق نے ہی دونوں کو اوپر سے دھکا دیا ہوگا۔ وہاں موجود کچھ لوگ صادق پر ٹوٹ پڑے لیکن دیگر لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے مشورہ دیا کہ پہلے بچوں کو اسپتال پہنچائیں اور پھر پولیس کو بلائیں۔ چنانچہ شہر کے سب سے بڑے اسپتال میں دونوں کو لے جایا گیا اور ادھر پولیس نے صادق کو اپنی حراست میں لے لیا اور کہا کہ جب تک بچوں کو ہوش نہیں آجاتا صادق عدالتی تحویل میں رہیں گے۔ اوپر سے گرنے کی وجہ سے ان کے سروں کے اعضاء کو سخت صدمہ پہنچا، جن میں سمعی اعصاب، نطقی جھلیاں اور سر میں بروکائی رقبہ شامل ہیں۔ ان کے آپریشن میں ڈاکٹروں کو کئی گھنٹے صرف کرنے پڑے، مگر شکر کی بات یہ ہوئی کہ یہ آپریشن کامیاب رہے۔ انہیں کچھ دن ڈاکٹروں کے زیر نگرانی رکھنا پڑا۔ جب ان کے حواس بحال ہوئے تو انہوں نے صادق صاحب کو بے قصور اور اپنے معاملہ کو ایک اتفاقی حادثہ بتایا۔ چنانچہ پولیس نے صادق صاحب کو رہا کر دیا اور اپنے ریکارڈ میں اسے ایک اتفاقی حادثے کے طور پر درج کیا۔ یہ حادثہ حیرت انگیز طور پر اس خاندان کے لیے نعمت ثابت ہوا کیونکہ ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق بچے کو صحت مند ہونے پر سُن بھی سکیں گے اور بول بھی سکیں گے۔

Masarrat Jahan
91.T, Sector 8
Jasola Vihar
New Delhi-110025

فرہنگ آصفیہ

آئینہ یا آئنہ- (بیائے معروف و مجہول) ف۔ اسم مذکر۔ در اصل (آہنہ از آہن ترکی۔ (پائینہ۔ ہندی۔ (آرسی) عوام (اینا) (چونکہ اول میں آئینہ لوہے سے بنایا گیا تھا۔ اس سبب سے اسے آہنہ کہتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ہائے ہوز کو حسب قاعدہ یائے تحتانی یا ہمزہ ملینہ سے مثل راہگاں اور رائگاں شاہگاں اور شائگاں باہم بدل کر آئینہ کہنے لگے۔ چنانچہ چار آئینہ جو ایک آہنی لباس جنگ ہے۔ صرف آہن ہی کے باعث اس نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مگر صاحب بہار عجم کی رائے ہے کہ یا تو یہ لفظ آہن بوزن و معنی آہن سے مرکب ہے کیونکہ گیلانی زبان میں لوہے کو آہن کہتے ہیں۔ اور اصل میں آئینہ لوہے سے بنایا گیا ہے۔ یالفظ آئین سے جس کے معنی زیب و زینت کے ہیں۔ یہ نام رکھا گیا اور ہائے ہوز دونوں صورتوں میں نسبت کے واسطے لگائی گئی ہے۔ اگرچہ صاحب موصوف کو ابھی تک شبہ باقی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک تا ریخوں سے بھی یہی ثابت ہے کہ یہ آہن سے بنا اور اسی سے یہ نام رکھا گیا اور زبان گیلان سے جو اس کی اصل نکالی ہے اسمیں بھی ہمیں کسی قدر تامل ہے کیونکہ گیلان چھوٹا سا ایران اور بغداد کے درمیان ایک شہر ہے۔ کوئی ملک نہیں ہے صرف ایک بزرگ کے سبب سے اسکا نام زیادہ مشہور ہو گیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کے اس لفظ نے یہاں تک رواج پایا ہو البتہ آہن کو تمام فارس جانتا اور بولتا ہے- اور علم زبان کے قاعدے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے پس ہماری رائے میں اسکا مادہ آہن ہی قرار دینا واجب اور سکندر اعظم کو اس کا موجد سمجھنا چاہئے۔ جب سکندر نے حکیموں سے اپنی رائے ظاہر کی کہ ہم ایک ایسی چیز بنانی چاہتے ہیں۔ جس میں ہر ایک چیز کا عکس دیکھ لیا کریں۔ تو انہوں نے معدنیات سے اس کو بنانا چاہا مگر جب اس سے مطلب حاصل نہ ہوا تو سکندر کی تدبیر سے ساملو یا رنے فولاد سے یہ کام لیا اور لوہے کو ایسی جلا دی کہ اسمیں ہر ایک چیز کا عکس معلوم دینے لگا صرف اتنی کسر رہی کہ اگر لوہے کا ٹکڑا چوکھونٹا ہوتا تھا تو اسمیں چوکھونٹی شکل دکھائی دیتی تھی۔ اور جو لمبوترا ہوتا تھا۔ تو لمبی مگر اخیر کو جب گول آئینہ بنایا تو یہ سب نقص جاتے رہیں۔ اور ہر ایک چیز جوں کی توں دکھائی دینے لگی۔ جب یہ آئینہ سکندر کے حسب منشا تیار ہو گیا تو اس نے بڑا جشن کیا اور اس میں اپنی صورت دیکھ کر پشت آئینہ کو بوسہ دیا۔ اب تک لوہے کا آئینہ بنا کرتا تھا۔ صرف دو تین صدی سے جب کانچ دریافت ہوئی اور وہ بآسانی کام دینے لگی تو اسکا رواج جاتا رہا۔ مگر بعض بعض لوگوں کے ہاں تبرکاً اب بھی پڑا ہوا ہے۔ اور اسکی تمثیل دیگوں کے بتوڑے سے جو بہت شفاف اور جھمکتا ہوا ہوتا ہے۔ خوب سمجھ میں آسکتی ہے۔

تطہیر

ایم اے کنول جعفری

ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نوید اپنی سیٹ سے اُٹھا اور کیبن سے باہر نکل آگیا۔ برآمدے میں ڈاکٹر زیبا دکھائی نہیں دی۔ شاید! وہ کسی مریض کا چیک اپ کر رہی ہو۔ یہی سوچ کر وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اُس کے کیبن کے سامنے پہنچا اور انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر تک بھی جب کوئی مریض کیبن سے باہر نہیں نکلا، تب اُس نے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ کیبن میں کوئی مریض نہیں تھا۔ زیبا اکیلی تھی۔ ڈیوٹی ختم ہونے اور مریض کے موجود نہ ہونے کے باوجود اُس کا کیبن میں بیٹھے رہنا سمجھ سے باہر تھا۔ وہ کرسی کی پشت پر سر لگائے لگاتار چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا، جیسے کسی گہری سوچ میں ہے۔ اُسے ڈاکٹر نوید کے کیبن میں داخل ہونے تک کا علم نہیں ہوا۔

''کیا بات ہے زیبا؟ ڈیوٹی ختم ہو گئی اور تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو! خیریت تو ہے!!'' ڈاکٹر نوید نے دریافت کیا۔

ڈاکٹر نوید کی آواز سن کر زیبا چونک گئی۔ اس کی زبان سے نکلا، ''ارے آپ! بس یوں ہی!! آؤ چلیں!!!''

زیبا نے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھایا اور نوید کے ساتھ کیبن سے باہر نکل گئی۔ دونوں ساتھ ساتھ اسپتال سے باہر آئے اور کار میں بیٹھ گئے۔ نوید نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کار حسب معمول گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔ زیبا ابھی بھی خاموش اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ چہرے پر ہمیشہ خوبصورت مسکان لئے رہنے والی بیوی کو اُداس دیکھ کر نوید نے اس کا سبب پوچھا، لیکن وہ ایسی کوئی بات نہیں کہہ کر ٹال گئی۔ نوید نے شاپنگ کے لئے معلوم کیا، تو اُس نے انکار کر دیا۔

نوید نے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور کار ڈرائیو کرتا رہا۔ قریب آدھا گھنٹہ بعد گھر آگیا۔ نوید نے کار پارکو میں کھڑی کی۔ زیبا نے اپنی جانب کی کھڑکی کھولی اور اتر کر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئی۔ رمشاء اسکول سے آچکی تھی اور دادی کے ساتھ ہنس کھیل رہی تھی۔ گاڑی پارک کر کے نوید بھی اندر آگیا اور اپنے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ ممی کو دیکھ کر رمشاء، دادی کو چھوڑ کر زیبا کے پاس آ گئی۔ اُس نے بیٹی کو گود میں لے کر پیار کیا۔ چار برس کی رمشاء انگلش میڈیم اسکول میں نرسری کلاس کی طالبہ ہے۔

نوید نے زیبا کی گود سے رمشاء کو اپنی باہوں میں لے لیا اور ہال میں آگیا۔ ماں وہاں پہلے سے موجود تھیں۔ کچھ دیر بعد زیبا بھی چائے کی ٹرے لے کر ہال میں داخل ہو گئی۔ حالانکہ چائے کی چسکیوں کے بیچ زیبا ہنس بول رہی تھی، لیکن اس کے چہرے سے دلکشی غائب تھی۔ رات کے کھانے کے دوران بھی زیبا کھوئی کھوئی نظر آئی، لیکن نوید خاموشی اختیار کئے رہا۔ سونے کے لئے بستر پر آنے کے بعد نوید سے نہ رہا گیا۔ اُس نے بڑے پیار سے زیبا کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ایک دوسرے کا دُکھ بانٹنے کے لئے میاں اور بیوی سے بہتر کوئی غمگسار نہیں ہو سکتا!!!

نوید کے دوسری بار سوال کرنے پر زیبا نے اپنی خاموشی توڑ دی، لیکن اداسی کا سبب بتانے سے قبل اس نے سوال کیا، ''نوید! آپ تو اس اسپتال میں ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ سے ڈاکٹری کر رہے ہو۔ ہر طرح کے مریض آپ کے پاس آتے رہے ہوں گے۔ آپ نے یہاں کے لوگوں کو کس طرح کا پایا؟ کیسے لگے آپ کو یہاں کے لوگ؟''

''زیبا! یہاں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ بہت مالدار یا پھر بے حد غریب! کافی لوگ بہت اچھے، سیدھے، محنتی اور محبت کے بھوکے ہیں۔ انہیں کام بتاؤ، تو دیر نہیں لگاتے، حکم دو تو فوراً بجا لاتے ہیں۔ بہت معصوم ہیں لواو قبیلہ کے لوگ۔'' نوید نے جواب دیا۔

''خواتین کے تئیں لواو کے مردوں کا رویہ کیسا ہے؟'' زیبا نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے معلوم کیا۔

''یہاں کے کئی قبیلوں میں مردوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بزرگ پنچوں کا حکم چلتا ہے۔ وہ جو کہہ دیں، وہ حتمی ہوتا ہے۔ عورتوں کو تو اُن کا فرمان ماننا ہی پڑتا ہے، کسی نوجوان مرد میں بھی ان کے خلاف لب کشائی کی ہمت نہیں ہوتی۔ مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟ کیا بات ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟ صاف صاف بتاؤ'' نوید نے ایک کے بعد ایک کئی سوال کر ڈالے۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' زیبا نے ایک چھوٹے سے جملہ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے، تو پھر کیا بات ہے؟ ضرور کچھ ایسا ہوا ہے، جسے تم چھپا رہی ہو! جس کی وجہ سے تم پریشان ہو۔ تمہیں اس طرح گم صم، اُداس اور فکر مند پہلے کبھی نہیں دیکھا!! سچ بتاؤ کیا بات ہے؟'' نوید نے اپنا سوال دوہرایا۔

زیبا نے ایک بار پھر چھت کی جانب دیکھا اور پلنگ کے تکیہ سے سہارا لیتے ہوئے کہنا شروع کیا، ''نوید قریب قریب دنیا کے ہر حصہ میں مردوں کی اجارہ داری ہے۔ تمام مرد خود کو اول اور عورتوں کو دوسرے درجہ کا شہری مانتے آئے ہیں۔ حالانکہ ہمارے ملک سمیت کئی دیگر ممالک میں بھی عورتوں کے حقوق مردوں کے مساوی تسلیم کئے جا چکے ہیں، لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ ان پر پوری ایمانداری کے ساتھ عمل بہت کم ہو پاتا ہے۔ ایک دور تھا جب رسم و رواج اور مذہبی پابندیوں کے سبب ہمارے وطن میں شوہر کے انتقال کے ساتھ عورت کی زندگی بھی ختم ہو جاتی تھی۔ بیوہ کو شوہر کی چتا کے ساتھ زندہ جلنا پڑتا تھا۔ راجہ رام موہن رائے اور لارڈ ولیم بینٹک کی کوششوں سے ستی کی رسم بند ہو گئی اور بیواؤں کے لئے پھر سے شادی کرنے کا راستہ کھل گیا، لیکن کینیا میں تو حد ہو گئی۔ 2015 میں حکومت کی طرف سے قانون بنا دینے کے باوجود لواو نام کا قبیلہ ابھی بھی پاکیزگی کے نام پر بیواؤں کے ساتھ جبر و تشدد اور حیوانیت کا برتاؤ کر رہا ہے۔ تکلیف دہ بات یہ بھی ہے کہ وہ ریپ جیسے گناہ کو مذہب کا لازمی جز مان رہے ہیں۔'' زیبا نے حیرت کا اظہار کیا۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو، میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ پہیلیاں بجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاف طور پر بتاؤ، آخر ماجرا کیا ہے؟'' نوید نے اپنی بات دوہرائی۔

زیبا نے تفصیل سے بتانے کی کوشش کی۔ ''لواو قبیلے میں بیواؤں کی صفائی کے نام سے ایک قبیح رسم چلی آ رہی ہے۔ رسم کے مطابق عورتوں کو پاکیزہ کرنے کے لئے انہیں سیکس کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ان بدنصیبوں کو اجنبی مردوں کے ساتھ زنا کے اذیت ناک گناہ سے گزرنا پڑتا ہے!!!

''کیا.....؟؟؟''

جی ہاں! میری اُداسی کا سبب یہی ہے۔ آج جب میں او پی ڈی میں بیٹھی مریضوں کو دیکھ رہی تھی، تبھی امیلیا نام کی ایک پچاس سالہ خاتون اندر آئی۔ اُس نے کہا کہ وہ اُس سے کچھ دیر تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتی ہے۔ بہتر ہو جو سب سے آخر کا وقت اُسے دے دیا جائے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ چیک اپ کرتے وقت جب میں نے اُسے ماں بننے کی خوشخبری دی تو وہ رونے لگی۔ میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں رونے کی قیاس آرائی کر رہی تھی کہ وہ بول اُٹھی، ''ڈاکٹرنی صاحب، میں بیوہ ہوں۔ کیا سماج کسی رانڈ کو بچہ پیدا کرنے کا حق دیتا ہے؟ میرے پیٹ میں پاپ پل رہا ہے اور میں ابھاگن زندہ ہوں۔ کاش یہ سب ہونے سے پہلے مجھے موت آ جاتی!''

''اس طرح کی درگتی کے لئے عورت ہی ذمہ دار ہوتی ہے۔ بیوہ کو تو زمانہ ویسے بھی چین سے نہیں رہنے دیتا۔ عورت کو یہ سب کرنے سے پہلے دس بار سوچنے کی ضرورت ہے۔ تم نے کیوں نہیں سوچا؟ اس سے اچھا تھا، کسی مرد سے باقاعدہ شادی کر لیتیں۔ اب نفسانی خواہش پوری کرنے کا خمیازہ تو تمہیں ہی بھگتنا ہے۔ بھگتو۔'' میں نے اُسے نصیحت دے ڈالی۔

''یہی تو رونا ہے ڈاکٹرنی جی! آپ بھی مجھے ہی قصوروار سمجھ رہی ہیں۔ ہم عورتوں کو مردوں کے سامنے زبان کھولنے کی اجازت کہاں ہے؟ اُن کا کام فرمان جاری کرنا اور ہمارا کام اُسے بے چوں چرا ماننا بھر ہے۔ کچھ کہنے کی جرأت کی جائے تو نافرمان سمجھا جاتا ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں نے اپنے جسم کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنے آپ کو مرد کے حوالے کیا ہوگا۔ نہیں بی بی جی انہیں!! لواو قبیلہ میں بیواؤں کی زندگی بڑی دشوار ہے۔ قدیمی رسم کے تحت بیوہ کو صاف صفائی کے نام پر 'تطہیر' کے کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔'' اتنا کہہ کر امیلیا نے گہرا سانس لیا۔

''قدیم رسم! تطہیر کا کرب!! یہ سب کیا ہے؟ ذرا تفصیل سے بتاؤ، تاکہ بات سمجھ میں آ جائے۔'' ڈاکٹر زیبا کا تجسس بڑھ گیا۔

قبیلے کے مردوں کے نزدیک بیوہ گندی اور ناپاک ہو جاتی ہے۔شوہر کی روح کی بخشش اور خود کو پاکیزگی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے بیوہ کو مرد کے ساتھ ہم بستر ہونا پڑتا ہے۔بزرگ مرد، بیوہ کو اس کی مرضی کے خلاف کسی بھی مرد کے حوالے کر دیتے ہیں۔ضروری نہیں کہ مرد جان پہچان یا بستی کا ہو۔کئی بار اُنہیں اجنبی اور درندہ صفت وحشیوں کے ہاتھوں میں سونپ دیا جاتا ہے اور وہ اُنہیں بے دریغ نوچتے رہتے ہیں۔چار ماہ قبل خود اُس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔شوہر کے انتقال کے بعد وہ اپنے پوتے پوتیوں کے درمیان سکون سے تھی۔چونکہ بیوہ ہوگئی تھی،اس لئے اُسے بھی 'تطہیر' کی فرسودہ رسم سے گزرنا پڑا۔وہ اس رسم کے خلاف تھی،لیکن مردانہ فرمان کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی۔

سنا کرتی تھی کہ 'تطہیر' کے لئے بیوہ کو پرائے مرد کے ساتھ ہم بستر ہونا پڑتا ہے۔بے ہودہ رسم کی ادائیگی کے لئے سیکس کی شروعات فرش پر ہوتی ہے۔بیوہ کو بے لباس ہو کر اپنے کپڑے فرش پر رکھنے پڑتے ہیں۔اس کے بعد وہ بستر پر چلی جاتی ہے،جہاں مرد اُس کے ساتھ جسمانی تعلقات بناتا ہے۔صبح اُٹھنے کے بعد فرش پر پڑے بدن کے اُترے کپڑے اور بستر کی چادر کو جلایا جاتا ہے۔اس کے بعد مرد اُسترے سے اس کے سر کے بال مونڈتا ہے۔صاف صفائی کے نام پر زنا اور زنا بالجبر کا تماشہ تین دن تک چلتا ہے۔مرد کی خاطر تواضع کے لئے بیوہ کو مرغی بھی پکانی پڑتی ہے۔چوتھے دن عورت کو اپنے والدین کے پاس جانے کی اجازت ہوتی ہے۔نام نہاد پاکیزگی کے بُرے عمل سے گزرنے کے بعد خاتون کو پورا گھر دھو کر صاف کرنا پڑتا ہے۔تب کہیں جا کر اس کے بچے گھر میں واپس آپاتے ہیں۔عجیب وغریب دستور یہ بھی ہے کہ مرد کو اس بدفعلی کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے،جو زیادہ سے زیادہ 25,700 کینین شلنگ (ڈھائی سو ڈالر) تک ہوتا ہے۔حالانکہ حکومت اس پر پابندی لگا چکی ہے،لیکن کچھ غریب اور دیہی علاقوں میں یہ بدترین رسم ابھی بھی جاری ہے۔''اتنا کہنے کے بعد امیلیا خاموش ہوگئی۔

''یہ دستور تو بہت بُرا ہے۔گناہ کے لئے آمادہ و مجبور کرنے سے تو بہتر ہے کہ بیوہ کی شادی کر دی جائے۔اس کے خلاف واقعی احتجاج کئے جانے کی ضرورت ہے۔''ڈاکٹر زیبا نے مشورہ دیا۔

''میں بیوہ،ماں کے ساتھ دادی بھی ہوں۔اس نام نہاد پاکیزگی کے عمل سے گزرنے کے لئے مجھے جس مرد کے حوالے کیا گیا تھا،وہ اجنبی،قوی،شرابی اور اوباش قسم کا تھا۔خون جاری ہونے کے باوجود وہ اپنی ہوس پوری کرتا رہا۔میں نے مرد سے کنڈوم استعمال کرنے کے لئے کہا تھا،لیکن وہ راضی نہیں ہوا۔نتیجتاً میں حاملہ ہوگئی۔بنا چاہا پاپ تو پیٹ میں پل ہی رہا ہے،فکر یہ ہے کہ کہیں مجھے ایچ آئی وی کا ہلاک کر دینے والا مرض نہ ہوگیا ہو۔پامیلا،سوسن اور سپنا کے پیر بھی اسی کی طرح بھاری ہیں۔سوزین اور ڈانا میں ایچ آئی وی کی تشخیص ہو چکی ہے۔''امیلیا نے اپنے دکھ اور خدشات کا اظہار کیا۔

''یہ تو بہت تکلیف دہ اور افسوسناک ہے۔''ڈاکٹر زیبا نے گہری سانس لی۔

''تطہیر کے نام پر منہ کالا کرنے والے مرد تو اپنے کام سے فارغ ہو کر چلے جاتے ہیں۔ان چاہا بوجھ تو عورت کو ہی جھیلنا ہے!!میں بیواؤں کی طرف سے آپ کے پاس مدد اور تعاون کے لئے آئی ہوں۔آپ ہماری رہنمائی کریں۔قبیلے والوں کو بیدار کریں اور اس دقیانوسی رسم سے نجات دلائیں۔''اتنا کہہ کر امیلیا اُٹھی اور اگلے دن آنے کی بات کہہ کر چلی گئی۔

''واقعی یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ریپ ہے!کھلا ریپ!!دُنیا بھر میں خواتین کے حقوق بحال کئے جا رہے ہیں۔سعودی عرب جیسے کٹر اور مذہبی ملک میں مستورات تیزی سے خود مختاریت کی طرف بڑھ رہی ہیں۔جہاں تہاں عورتیں،مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کر رہی ہیں،لیکن لواو قبیلے کے لوگ ابھی بھی غیر مہذب اور جنگلی زندگی بسر کر رہے ہیں۔یہ سب تعلیم کی کمی اور مذہبی رواج کے نام پر کیا جا رہا ہے۔نا سمجھ یہ بھی نہیں جانتے کہ بیوہ کے ساتھ کیا جانے والا یہ نازیبا عمل عورتوں کو پاک کرنے کی بجائے اُنہیں ناپاک اور پراگندہ کر رہا ہے۔''ڈاکٹر نوید نے اپنے تاثرات ظاہر کئے۔

ڈاکٹر نوید لواو کی بیواؤں کے درد سے واقف ہو چکا تھا۔اُس نے زیبا کو یقین دلایا کہ اگر وہ ان مظلوم خواتین کی حقوق بحالی کے لئے کوئی کارگر قدم اُٹھانا چاہتی ہے،تو وہ قدم بہ قدم اُس کے ساتھ رہ کر ہر ممکن تعاون کرے گا۔زیبا کو شوہر سے یہی امید تھی۔ان الفاظ نے اُسے بڑی تقویت پہنچائی۔اُس کی آنکھوں میں امید کی چمک اور چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اگلے روز ڈاکٹر زیبا نے امیلیا کا ایچ آئی وی ٹیسٹ کرایا۔امیلیا کا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ٹیسٹ میں مہلک مرض کی تصدیق ہوئی۔امیلیا اس حقیقت سے بخوبی واقف تھی کہ ایچ آئی وی کے مرض میں مبتلا شخص کی زندگی طویل نہیں ہوتی۔مختصر زندگی کے باوجود اُس نے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور 'تطہیر' کے جارحانہ قدیمی عمل کو روکنے کے لئے ہر ممکن احتجاج کا فیصلہ کر لیا۔ڈاکٹر زیبا اور اس کے شوہر کا ساتھ ملنے سے اُسے یقین ہو گیا کہ دیر سویر لواو قبیلے کی بیواؤں کو تطہیر کے نام پر قبیح دستور سے

نجات مل جائے گی۔

ڈاکٹر نوید نے اس بابت کئی لوگوں سے بات کی۔ انہیں اونچ نیچ سمجھائی اور ہموار کرنے کی کوشش کی۔ کئی افراد کے خیالات میں تبدیلی دیکھ کر اُسے اپنا کام آسان ہوتا نظر آیا۔

اتوار کے روز ڈاکٹر زیبا نوید نے قبیلے کے تمام لوگوں کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد انہیں دوسرے ملکوں میں زمانہ قدیم سے چلے آرہے کئی غلط رواجوں اور بے ہودہ رسموں کو ختم کئے جانے کی تفصیل سے جانکاری دی۔ ڈاکٹر نوید نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ شادی سے پہلے لڑکے کے ذریعہ لڑکی کے ساتھ جسمانی تعلق بنانا پوری طرح ناجائز اور گناہ ہے۔ اسے معاشرہ صرف اس لئے ناپسند کرتا ہے کہ ایسا کرنے سے لڑکی ناپاک ہو جاتی ہے۔ کسی بھی سماج کے لئے یہ اچھی نگاہ سے دیکھا جانے والا عمل نہیں ہے۔ لڑکے میں چاہے کتنے ہی عیوب ہوں، لیکن وہ شادی سے قبل بدفعلی کے عمل سے گزرنے والی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے سے کتراتا دیکھا جاتا ہے۔ سوچنے والی بات ہے کہ جب جسمانی تعلقات سے دوشیزہ ناپاک ہو جاتی ہے، تب کسی بیوہ کے ساتھ کیا جانے والا اسی طرح کا ناپسندیدہ اور گندہ عمل اُسے کس طرح پاکیزہ بنا سکتا ہے؟؟ ہمارے وطن میں بھی 'ستی' کی رسم تھی۔ مرد کی موت کے بعد بیوی کو شوہر کی چتا کے ساتھ جلایا جاتا تھا، جبکہ عورت کے انتقال کے بعد مرد اس رسم سے مستثنیٰ رہتا تھا۔ اب یہ رواج بند ہو چکا ہے اور بیواؤں کی دوبارہ شادیاں ہو رہی ہیں۔

ڈاکٹر نوید کے بعد ڈاکٹر زیبا نے کہنا شروع کیا: ''لواو قبیلے کے ذمہ دار لوگوں! پاکیزگی کے عمل سے کئی عورتیں کسی حال سے ہو گئی ہیں۔ ان کے پیٹ میں پلنے والے بچے کسی بھی طور پر جائز نہیں کہے جا سکتے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ پیدا ہونے کے بعد بچوں کو کون اپنائے گا؟ اُن کی دیکھ بھال اور پرورش کی ذمہ داری کس کی ہوگی؟ یہ بات سخت تکلیف دہ ہے کہ طبی جانچ میں دو عورتوں میں جان لیوا مرض 'ایچ آئی وی' کی تشخیص ہوئی ہے۔ ان میں ایک حاملہ ہے۔ اس کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ جنم سے ہی 'ایچ آئی وی پازیٹو' ہوگا۔ ماں اور بچے کو بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کرنے والے سماج کے پاس اس خطرناک بیماری کا کیا کوئی علاج ہے؟ اس کے لئے کون جواب دہ ہے؟ ایک دقیانوسی، فرسودہ، غلط، قبیح اور نقصان دہ رسم کو بے سبب زندہ رکھنے کے نتائج کبھی بھی اچھے نہیں ہو سکتے! سنجیدگی سے سوچئے۔ اب تک ہونے والے نقصان کی تلافی تو ممکن نہیں، ہاں آئندہ کے لئے اس پر سختی سے کاربند ہو کر نئی نسلوں کے لئے بہتر راہِ عمل کو اُستوار کیا جا سکتا ہے۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔''

قبیلے والوں پر خاموشی طاری تھی۔ سب ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھا۔ آخرکار قبیلے کے سب سے بزرگ شخص پیٹرک کھڑے ہوئے: ''ڈاکٹر صاحبان! آپ لوگوں نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ بات بھی سمجھ میں آگئی ہے۔ موت اور حیات تو خدا کے قبضے میں ہے۔ مرد کے انتقال میں عورت کا کیا قصور؟ بیوہ کو کس جرم کی سزا دی جاری ہے؟ صرف اس لئے کہ قدیمی ریت ہے۔ اگر ایک کے انتقال کے بعد دوسرے کو سزا دی جاتی ہے، تو عورت کی وفات پر مرد کے لئے کوئی سزا تجویز کیوں نہیں کی گئی؟ یہ واقعی ناانصافی ہے۔ اب آگے ایسا نہیں ہوگا۔ میں کھیا ہونے کے ناطے قبیلے کے مرد و خواتین کے درمیان اعلان کرتا ہوں کہ آج کے بعد بیوہ ہونے پر کسی عورت کو نام نہاد پاکیزگی کے قبیح عمل سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ آج سے بیوہ کو اپنی مرضی سے گھر بسانے کی بھی اجازت ہے۔

اس فیصلے کے بعد ڈاکٹر نوید اور ڈاکٹر زیبا بہت خوش تھے۔ امیلیا کے چہرے پر فاتحانہ چمک کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی چھلک آئیں!!

M. A. Kanwal Jafri
127/2, Jama Masjid,
NEENDRU, Tehsil Dhampur,
Distt. Bijnor (U.P.) 246761,

فرہنگ آصفیہ سے

بیت – ع۔ اسم مؤنث (۱) (مرکبات میں) گھر۔ مسکن۔ مکان (۲) خاندان جیسے اہل بیت (رسول اللہ ﷺ کے خاندان والے) (۳) فرد شعر۔ دوہا۔

بیت الحرام ۔ ع۔ اسم مذکر۔ وہ گھر جسمیں قتل او ربعض مباحات کو منع کیا گیا ہے۔ خانہ کعبہ۔ مکہ۔ حرام اگرچہ مصدر ہے مگر اس جگہ مفعول کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

بیت الحزن ۔ ع۔ اسم مذکر (۱) رنج کا گھر۔ غم کدہ۔ کلبۂ احزاں۔ غمخانہ (۲) اس کمرہ کا نام جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام تنہا بیٹھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں رویا کرتے تھے۔ مجازاً ہر عاشق مہجور کا گھر۔

بیت الصنم – ع۔ اسم مذکر (۱) بت خانہ۔ مندر (۲) معشوق کا گھر۔ محبوب کا مکان

کہانی

ڈاکٹر خالدہ ناز

یادوں کے سائے

وہ اپنے لق ودق کمرے میں تنہا بیٹھا اپنی زندگی کی اسی (80) بہاروں میں اپنے وجود کا محاسبہ کر رہا تھا۔ اس نے لگ بھگ تیس ہزار دنوں تک جی کر کیا کیا؟ اسے یاد آیا کہ ساٹھ (60) سال تو اس کو دے دیے۔ لیکن اپنی زندگی کے بیس سال سے اٹھائیس سال تک کی زندگی ہی اس کے لیے بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ جس میں اس کو پالینے کی تمنا ایک نظر دیکھنے کی خواہش اور بہت سے خوابوں کے تانے بانے شامل تھے۔ لیکن اتنی لمبی مسافت تو اس نے صرف اس کی یادوں کے سہارے طے کی ہے۔ اور اب زندگی کے آخری پڑاؤ میں اس نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ شادی شدہ زندگی اور تنہا زندگی میں بہت فرق ہے۔ شادی شدہ انسان کے لیے زندگی سنوارنا اور مستقبل پر نظر رکھنا اسے تلخ سے تلخ ماضی کی یادوں سے دور کر دیتا ہے۔ جبکہ ایک تنہا آدمی نفسیاتی طور پر ہمیشہ ماضی کی خوبصورت یادوں سے جڑنے کی وجہ کر اپنے حال کو بھی برباد کر لیتا ہے۔ کیونکہ کچھ خوبصورت یادیں ہی اس کی سرمایۂ حیات ہوتی ہیں۔ لیکن عمر گزرنے کے ساتھ، ساتھ اب اکثر اس پر تنہائی کا احساس زیادہ حاوی ہو جایا کرتا اور وہ بے چین ہو جاتا۔ والدین کے گزرنے کے بعد وہ گاؤں جانا ہی چھوڑ چکا تھا۔ یہ اور بات کہ سرکاری ملازمت اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی پیسے کی فراوانی کسی نہ کسی رشتہ دار کو جوڑے رکھتی۔ کئی بھتیجا بھتیجی اور بھانجی کو اپنے پاس رکھ کر پڑھایا لکھایا۔ سب اپنی، اپنی منزل پر رواں دواں ہوتے گئے۔ بس اس بوڑھے کے پاس بیٹھنے کے لیے اب کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ماضی کی یادیں ہر لمحہ کتاب زیست کے کھلتے ہی ورق الٹا دیتی اور وہ اس کی یادوں میں ایسا کھو جاتا کہ کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔

آج طاہر صاحب کے لڑکے کی شادی تھی۔ بڑے سے گھر میں تنہا رہنے کی وجہ سے اکثر پاس پڑوس کے لوگ اپنے گیسٹ کے لیے اس کا روم لے لیا کرتے اور وہ خوشی، خوشی اس پیش کش کو قبول کر لیا کرتا۔ اسے بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ اس بہانے رونق لگی رہتی تھی۔ سو آج گھر میں چہل پہل تھی۔ اور وہ صبح ہی صبح اپنے لان میں بیٹھا چائے کی چسکیوں کے ساتھ آج کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کچھ میگزین اس کی میز پر رکھے تھے۔ تب ہی وہ اجنبی قریب آ گیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد اس نے بتایا کہ اچھی کتابوں کا مطالعہ اس کی کمزوری ہے۔ پہلے ایسا نہیں تھا لیکن شادی کے بعد چونکہ اس کی جیون ساتھی کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔ اور اس کو خوش دیکھنے کے لیے اس نے بھی یہ شوق پال لیا ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ انجینئر ہے۔ طاہر صاحب کا لڑکا اور اس کا لڑکا دونوں بہت اچھے دوست ہیں۔ اسی مناسبت سے وہ اس شادی میں آیا ہوا ہے۔ مقصد بس گھومنا پھرنا ہے۔ جس روانی اور زندہ دلی کے ساتھ اس نے اپنا لمبا چوڑا تعارفی خاکہ پیش کیا تھا۔ وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ آدمی کافی زندہ دل ہے۔ بہت دنوں بعد کسی نے اتنی خوبصورت گفتگو کی تھی۔ اس نے اپنے نوکر کو آواز دے کر چائے منگوائی۔ اور یوں ہی باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اس کا ساتھ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ جو بہت باتونی قسم کا آدمی تھا اس کا نام فیض تھا۔ تعارفی تبادلے کے بعد کچھ ذاتی سوالات تک رسائی ہوئی۔ آپ کے بیوی بچے آپ کے ساتھ نہیں ہوتے کیا؟ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے لمبی سانس لی اور اس کا ذہن کہیں دور خلاؤں میں بھٹکنے لگا۔ یہ سچ ہے کہ یہ تنہائی اس نے خود ہی مول لی تھی۔ گھر والوں کے بہت سمجھانے کے باوجود وہ

شادی کے لیے تیار نہیں ہوا۔

ایک شخص زندگی میں مجھ سے ہوا دور کیا۔ اس کے خطوط اور اس کی یادیں تو ساتھ ہیں۔ بس اسی احساس کے ساتھ زندگی گزارتا رہا۔ دن تو مصروفیتوں میں بیت جاتا لیکن راتیں اس کی یادوں کے لیے وقف تھیں۔ اس کے ذہن میں آج بھی وہ اسی طرح قید تھی۔ وہ اپنی کھلی اور بند آنکھوں سے ہر لمحہ اسے محسوس کرتا کالج جاتے وقت چھپ، چھپ کر اس کا دیکھنا، اس کی شوخ ہنسی، جو کہہ نہ سکتی اسے خطوط کے ذریعہ کہنا۔۔۔۔۔ ''آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ بہت ہینڈسم ہیں، آپ بہت سوبر ہیں، آپ میرے آئیڈیل ہیں، میں آپ کے بغیر زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتی۔۔۔'' یہ سارے اس کے خطوط کے وہ چھوٹے، چھوٹے جملے تھے جسے وہ اب بھی تصور میں اس کے لب سے نکلے الفاظ کی طرح محسوس کرتا اور اب بڑھاپے میں سائنس اور ٹکنالوجی کی دنیا میں پہنچ کر یہ ضرور سوچا کرتا کہ کاش اس کا زمانہ بھی موبائل اور انٹرنیٹ کا زمانہ ہوتا۔ اور وہ کہیں بھی گیا تھا لیکن اپنی زیبا سے باتیں کرتا رہتا یا اس کے والدین بھی آج کے والدین کی طرح اپنے بچوں کے دوست ہوتے اور وہ بے جھجک اپنے من کی بات ان کے روبرو پیش کر سکتا۔ اسے مناسب وقت کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔

جب وہ بنگلور سے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری لے کر لوٹا تھا تو زیبا کا خاندان کہیں دوسری جگہ منتقل ہو چکا تھا۔ جبکہ دو مہینہ قبل وہ آیا تھا تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اچانک اپنی بہن کے رشتے کے سلسلے میں آیا تھا۔ یہ اور بات کہ اس سے ملنے کا موقع نہیں مل پایا تھا۔ وہ اس کی بہن کے پاس آئی بھی تھی لیکن صرف دور سے ہی نظروں کا ملاپ ہوا تھا۔ جانے ان نگاہوں میں کیا تھا جسے وہ اب تک نہیں بھول پایا۔ صبح ہی اس کی واپسی ہو گئی تھی۔ اس لیے ساتھ میں چپکے سے دیا ہوا اس کا خط بھی نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ کر واپس ہو گیا تھا اور خوش بھی تھا کہ اب آنے کے بعد باضابطہ گھر والوں کو بھیجوں گا کہ ابھی تو بہن کی شادی زیادہ ضروری ہے۔ پھر یہ احساس کہ زیبا تو میری ہے ہی!

پھر چھ مہینوں بعد وہ واپس نوکری کے پروانے کے ساتھ لوٹا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ بہن کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ آتے ہی ڈھیروں کام میں مصروف ہو گیا۔ لیکن ہر پل وہ اپنی زیبا کو تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کے بائیں گال کی چھوٹی سی کالی تل اسے پریشان کرتی۔ تو کبھی وہ اس کی آنکھوں کی گہری جھیل میں کھو جاتا۔ وہ اب تک اسے نظر نہیں آئی تھی۔ اور وہ شادی کی دیگر مصروفیات میں دعوت کے کارڈ تقسیم کرنے کی ذمے داری لے کر بہت خوش تھا۔ لیکن دعوت نامہ لکھتے وقت جیسے ہی اسے یہ پتہ چلا کہ محمود صاحب گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ ان کی بیٹی کی شادی ہے۔ انہیں اچانک بہت اچھا رشتہ مل گیا ہے۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ وہ ایسا حواس باختہ ہوا کہ ساری خوشی جاتی رہی۔ اس ایک جملے کی بازگشت بار، بار اسے بے چین کیا کرتی کہ میں آپ کے بغیر زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتی۔ اس سے کتنی بڑی بھول ہو گئی تھی اسے پہلے ہی رشتہ بھجوا دینا چاہیے تھا۔ وہ کیوں اپنی نوکری کا انتظار کرتا رہ گیا۔ لیکن اس بات کا ذکر بھی تو اسی نے کیا تھا کہ میرے ممی پاپا نوکری والے کو ہی ترجیح دیں گے۔ پلیز آپ جلدی کریں۔ میں خود سے کچھ نہیں کر سکتی۔ اسی کے لیے تو جی جان لگا کر اس نے اتنی اچھی نوکری حاصل کی تھی۔ کاش، کاش اور اسی کاش کے بیچ دن یوں ہی گزرتے گئے اس نے ایک سے ایک اچھے رشتوں کو ٹھکرا دیا اس پر ہر پل یہ احساس حاوی رہتا کہ وہ بھی میرے بغیر چین سے نہ ہوگی۔

جب بہت دیر کی خاموشی کے بعد فیض صاحب نے میگزین کی ورق گردانی سے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں تو اقبال صاحب کی حالت کو دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ ''ارے یہ کیا آپ کی آنکھوں میں آنسو؟ سوری مجھے نہیں پتہ آپ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا اور آپ نے کس طرح اپنی متاع حیات کو کھو دیا۔'' پھر باتونی قسم کے فیض صاحب نے اس پر بھی ایک تقریر جھاڑ دی کہ یہ سچ ہے کہ بڑھاپے میں میاں بیوی میں سے کسی ایک کے نہیں رہنے سے زندگی بے کار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ان کی محبت اور پختہ ہوتی جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم بن جاتے ہیں۔ لیکن ہاں بیوی کے بغیر مرد زیادہ ادھورا ہو جاتا ہے۔ بیوی کی طرح چھوٹی، چھوٹی باتوں کا خیال اور کوئی رکھ ہی نہیں سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اسے خوش رکھنے کے لیے اس سے جڑی چھوٹی، چھوٹی باتوں کا خیال رکھتا ہوں۔ جبکہ شروع سے ہی وہ خاموش طبیعت کی مالک ہے۔ یہ میرا اپنا خیال ہے کہ مرد کے لیے بیوی بہت بڑا عطیہ ہوتی ہے۔ میری بیوی بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ہے اور میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہر گزرتے ہوئے دنوں میں ہماری محبت جوان ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ ارے، ارے آپ تو بہت پریشان ہو گئے سوری میں زیادہ بول گیا۔ کچھ بتایئے اپنے بارے میں۔۔۔۔

فیض صاحب کیا بتاؤں۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی ایسے انسان سے ملا تھا جس نے اپنی شادی شدہ زندگی کے خوبصورت احساسات کو اس کے سامنے اس طرح پیش کیا تھا۔ حالانکہ اپنی تنہا زندگی کی لمبی مسافت نے اسے یہ احساس تو ضرور کروا دیا تھا

کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے کتنے ضروری ہیں۔ لیکن ابھی بھی وہ خود کو اس احساس سے آزاد نہیں کر پایا تھا کہ اگر من چاہا رشتہ نہیں ہوتا تو ذہنی ہم آہنگی بن ہی نہیں سکتی۔ کیا زیبا بھی اپنی شادی شدہ زندگی سے بہت خوش ہوگی۔ بارہا اس نے اپنے من سے یہ سوال کیا تھا۔ اور جواب نفی میں ہی ملا تھا۔ یا یہ صرف اس کے من کا وہم تھا۔ لمبی خاموشی کے بعد فیض صاحب پھر گویا ہوئے۔ اقبال صاحب میں تو آپ کے لیے ایک اجنبی ہوں۔ پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ آپ اپنا دکھ مجھ سے شیئر کریں تا کہ آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ آج اسے بھی ایسے ہی غمگسار کی ضرورت تھی جو بے ضرر تھکنوں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس لیے اپنی داستان زندگی کھول کر رکھ دی اور شادی نہ کرنے کی ساری وجہ بھی بتادی۔ حد تو یہ کہ اپنے اس خدشے کو بھی گوش گزار کر دیا کہ وہ جس لڑکی کو چاہتا تھا وہ بھی چین سے نہ ہوگی۔ یہ اس کے دل کی آواز ہے۔۔ تب ہی ایک نسوانی آواز نے ان دونوں کی باتوں کے سلسلے کو منتشر کر دیا۔ فیض صاحب میں تیار ہوگئی اب آ بھی جایئے۔ غالباً یہ آپ کی بیگم ہیں۔ بالکل صحیح سمجھا آپ نے۔ لیجئے وہ آ بھی گئیں۔۔۔۔ السلام علیکم جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اپنے لڑکھڑاتے وجود کے ساتھ اتنا ہی کہہ پائی کہ میرے ہسبنڈ تو آپ سے اس طرح باتیں کر رہے ہیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ بیگم یہ دیکھیں ان کے پاس کتنی اچھی، اچھی کتابیں ہیں۔ جسے دیکھ کر آپ بے حد خوش ہو جائیں گی۔ اقبال صاحب سے میں نے آپ کے لیے مانگ لی ہیں۔۔۔ وہ بڑے ترنگ میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے جو اپنی عادت کے مطابق اقبال صاحب سے متعلق ساری جانکاری اپنی بیگم کو دینے کے لیے بے چین تھے۔ جنہیں یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ان کی خاموش، خاموش اور کھوئی، کھوئی سی بیگم ماضی کی یادوں میں سفر کر رہی ہیں۔ انہیں تو یہ بھی نہیں پتہ کہ جس بیگم کو خوش رکھنے کے لیے وہ ہزاروں جتن کیا کرتے ہیں۔ اور یہ انوکھی داستان سنا کر انہیں حیرت میں ڈالنے والے ہیں۔ جو اچانک یہ سن کر تڑپ اٹھتی ہیں کہ اقبال صاحب نے اب تک شادی ہی نہیں کی ہے۔

Dr. Khalida Naaz
New Colony, Islam Nagar
Bhagalpur-812001(Bihar)
Mob: 7250069426

فرہنگ آصفیہ سے

انور – ع۔ (نور) کا افضل التفضیل ( ) زیادہ روشن ( ) خوبصورت نورانی ( ) سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا دہلوی خلف سید جلال الدین خوشنویس شاگرد ذوق کا تخلص جنہیں وفات پائے دس پندرہ برس ہوئے ظہیر آپ ہی کے برادر کلاں ہیں۔

انوری – ع۔ اسم مذکر۔ ایشیا کے ایک نہایت مشہور فارسی گو شاعر کا تخلص جس کا نام اوحدالدین اور مولد خاوران ہے۔ چنانچہ اول اس وجہ سے اس نے اپنا تخلص خاوری قرار دیا تھا مگر بعد ازاں اپنے استاد عمادثانی کے ارشاد سے اسے بدل کر انوری ٹھہرایا۔ مدرسہ منصوریہ میں پڑھا۔ اس زمانہ کے تمام حکماء اور فلاسفہ پر غالب آکر حکیم اوحدالدین کے نام سے مشہور ہوا۔ جیسا علم کا مایہ دار تھا ویسا ہی دنیوی زر و مال سے نادار۔ اسی وجہ سے اپنی عمر فقر و فاقہ میں بسر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حسب اتفاق سلطان سنجر سلجوقی اور ابو الفراح سنجری ملک الشعراء کا لشکر مقام رادکان میں جو مشہد مقدس کے قریب واقع ہے۔ آن کر ٹھہرا۔ اسکی شان و شوکت دیکھ کر ارادہ کیا کہ زمانہ کی رفتار کے موافق منطق و فلسفہ سے باز آکر شعر و سخن پر مائل ہو۔ چنانچہ اس شب کو سلطان سنجر سلجوقی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس پر بہت انعام و اکرام ملا۔ یہاں تک کہ خود بادشاہ اس کے گھر آیا۔ اہل سخن اسے پیغمبر سخن مانتے ہیں۔ حکیم انوری کو نجوم کا بھی دعویٰ تھا۔ چنانچہ اس نے سلطان طغرل شاہ سلجوقی کے عہد میں دعوے سے کہا کہ فلاں روز مثل طوفان نوح باد آئے گا مگر وہ دعویٰ غلط نکلا جس کی نسبت ایک شاعر نے قطعہ ذیل موزوں کیا۔ قطعہ –

گفت انوری کہ از اثر بادہائے سخت
ویراں شود عمارت کشیا زبر سری
در روز حکم او نہ وزیدست ہیچ باد
یا مرسل الریاح تو دانی و انوری (قطعہ)

پس حکیم انوری بادشاہ کے خوف سے بھاگ کر بلخ پہنچا۔ بلخ والوں کی بدسلوکی دیکھ کر ان کی ہجو کہی وہ اس کے دشمن ہو گئے اور ایک اوڑھنی اس کے سر پر ڈال کر خوب رسوا کیا۔ قاضی حمید الدین فاضل بلخ نے اسکی حمایت کی۔ انوری نے ڈر کر بلخ کی مدح میں بھی ایک قصیدہ لکھ ڈالا۔ مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور اخیر کو بلخیوں نے قاضی کی بے خبری میں انوری کو قتل کر ڈالا۔ ۵۹۲ھ میں یہ واقعہ پیش آیا اور اسی شہر میں غریب کو احمد خضرویہ کے پہلو میں سلا دیا

پھانس

نصرت حشمی

میں نے اس خط کو چوتھی بار پڑھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسا درد ہے جو اس ٹکڑے میں وہ بزرگ خاتون سما کر میرے حوالے کر گئی ہیں۔

میری ان سے ملاقات چھ ماہ پہلے اسپتال میں ہوئی تھی۔ وہ بے چاری زندگی اور موت کے درمیان جھول رہی تھیں اور میں اپنے پیشے کے اعتبار سے پریکٹس پر تھی۔ ان کے آس پاس ان کے ملنے جلنے والوں اور رشتہ داروں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ میں اکثر رات کی ڈیوٹی پر ہوا کرتی اور جب میں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوتی ان کے کمرے میں آجاتی۔ دیکھنے میں وہ جاذب نظر عورت تھیں۔ یک دم نظر پڑتے ہی انھیں دوبارہ دیکھنے کی خواہش ہوا کرتی۔ کچھ ایسی کشش تھی ان کی شخصیت میں کہ میں ان کی طرف کھنچی چلی گئی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوتا کہ رات میں ان کی طبیعت کچھ بہتر ہوا کرتی اور مجھ سے باتیں کرتی رہا کرتیں۔ حالانکہ ان کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار روزانہ ان کے پاس رکتا مگر میری موجودگی کے احساس سے وہ بے فکر ہو کر سو جاتا۔ پھر ہم دونوں گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ وہ ایک پڑھی لکھی باشعور سمجھدار اور مخلص خاتون تھیں۔ چہرے کی ہر ہر جھری میں تجربہ، مشاہدہ موجود تھا۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اپنے وقت میں وہ بہت ہر دل عزیز شخصیت رہی ہوں گی۔ پورا خاندان تھا ان کا، بہوئیں، بیٹے، بیٹیاں اور سب ان کے لیے بہت مخلص بھی تھے۔ ان کی عمر کوئی 75 سال کے قریب ہوگی۔ ابھی دو سال پہلے ہی ان کے شوہر کا انتقال ہوا تھا۔ یہ سب مجھے ان کی زبانی پتہ چلا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ اب اس اسپتال سے ان کی لاش ہی جائے گی۔ ان کی بیماری آخری نہج کو پہنچ چکی ہے۔ بس سب کو اس پل کا انتظار ہے جب سانس کی ڈور ٹوٹ جائے وہ آخری ہچکی لیں۔ لاعلاج ہونے کے بعد بھی آخری سانس کو آسان بنانے کے لیے کچھ علاج کی ضرورت تھی اور یہی علاج یہاں فراہم کرایا جارہا تھا۔

ایسے ہی ایک دن باتیں کرتے کرتے انھوں نے میرے ہاتھ میں ایک بند لفافہ تھما دیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ میری زندگی کی سب سے قیمتی چیز ہے اگرچہ تمھارے لیے بیکار ہے مگر پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میرے جانے کے بعد لوگ مجھے جانیں۔ میں اسے ایسے کسی ہاتھوں میں سونپ کر جاؤں جو اس کا مفہوم سمجھ سکے اور اتنے مہینوں کی ملاقات کے بعد لگتا ہے وہ ہاتھ صرف تمھارے ہی ہو سکتے ہیں مگر! اسے میرے مرنے کے بعد ہی پڑھنا اور میرے جنازے میں ضرور شرکت کرنا۔"

میں نے لفافہ پکڑ لیا اور بے چین ہو کر اسے کھولنے کا ارادہ کیا مگر اس وعدے نے مجھے باندھے رکھا جو ابھی ابھی میں نے ان کا ہاتھ تھپ تھپا کر انھیں دیا تھا۔

"انتظار کرو......"

انھوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور میں بے اختیار ان کے گلے لگ گئی۔ اتنا اپنا پن دے دیا تھا انھوں نے مجھے چند لمحوں میں، میرا دل بھر گیا۔

"خالہ!"

میں نے رندھی ہوئی جذبات سے پر آواز میں انھیں پکارا۔
یہ ان کی آخری رات تھی۔ صبح دس بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھ پر ان کے انتقال کا بہت اثر ہوا تھا۔ مجھے ان کی گریس فل شخصیت نے کافی متاثر کیا تھا اور پھر انھوں نے مجھے اتنا اپنا پن دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے قیمتی تحفہ میرے حوالے کر گئی تھیں۔ اب مجھے اس خط کو کھولنے کی جلدی تھی مگر کئی دن نہایت مصروف کے گزرنے کے سبب یہ کام ٹلتا گیا۔

ان کے انتقال کے پانچویں دن میں نے ان کا بند لفافہ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔ کوئی لمبا چوڑا خط نہیں تھا مگر اس مختصر سی تحریر میں ان کی پوری زندگی سمائی ہوئی تھی۔ اسے پڑھ کر میں حیران رہ گئی اور میرے ذہن میں بہت سے سوالات گڈمڈ ہونے لگے۔ میں نے خط کو پڑھا پھر پڑھا اور پھر پڑھا اور ہر بار میری ہچکی بندھ گئی۔ اف! عورت واقعی سمندر ہے۔ برداشت کی طاقت، سمجھوتے کی مٹی، وفا ایثار و قربانی، اذیتیں سہہ کر مسکراہٹ کے زیور سے خود کو مزین رکھنا، سب کچھ کسی تہہ خانے میں بند کر کے دنیا کے کاندھے سے کاندھا ملا کر حالات کے ساتھ آگے بڑھنا۔ اللہ نے کیا بنایا ہے عورت کو؟ کیسے کیسے ستم جھیلنے پڑتے ہیں اس نفس کو، جسے لوگ صنف نازک کہتے ہیں۔ خط میں لکھا تھا:

میری عمر جب سترہ سال کی تھی تب میں نے انجانے میں ہی کسی کو اپنا من میت بنا لیا تھا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ یہ تو پتہ نہیں ہاں مگر ہوا تھا۔ بہت کچھ میرے اندر بدلا تھا۔ بہت سے خواب میں نے نہیں، ہم نے دیکھے تھے۔ ایک دوسرے کے سنگ سنگ، بہت خاموش محبت تھی جو صرف اس کے اور میرے درمیان تھی۔ جس کو کبھی کسی الفاظ کا محتاج بھی ہونا نہیں پڑا۔ صرف آنکھیں ہی وہ احساس ذریعہ تھیں جو اس وادیٔ عشق میں ہم دونوں کو ہواؤں کے دوش پر لیے پھرتی تھیں۔ ان دنوں میں خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب اور حسین لڑکی تصور کیا کرتی تھی حالانکہ میں حسین بالکل نہیں تھی۔ میں نے اس کے ساتھ اور اس نے میرے ساتھ کبھی کوئی غیر مہذب حرکت کبھی نہیں کی جو آج لوگ محبت کے نام پر کرتے نظر آتے ہیں۔ میرے نزدیک محبت ایک ایسا پاکیزہ جذبہ ہے جو روح سے روح کو جوڑ دے تو پھر تا عمر یہ رشتہ نہیں ٹوٹتا۔ ایسا ہی رشتہ بندھ گیا تھا ہم دونوں کے درمیان، جس کی مضبوطی کا احساس بعد میں ہوا۔ ابھی تو میں نے خواب دیکھے بھی نہیں تھے ابھی تو میں اپنے نئے جذبوں سے پوری طرح آشنا بھی نہیں ہوئی تھی کہ میرے گھر والوں نے مجھے کسی اور کے سنگ باندھ دیا۔ یہ فیصلہ میرے لیے موت کے اعلان سے کم نہ تھا۔ میں اندر ہی اندر تڑپی چلائی چیخی مگر لاحاصل، ایک دن مجھے سرخ جوڑے میں لپیٹ کر اس کے حوالے کر دیا گیا۔

اس زندگی کی پہلی صبح ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میرا شریک سفر ایک اچھا انسان ہے۔ اس کے ساتھ زندگی بہت خوبصورت گزاری جا سکتی ہے جس کی شروعات میں نے کر دی تھی۔ وقت تیزی سے گزرنے والی شئے کا نام ہے۔ زندگی میلے لگاتی گئی اور میں اس میں ضم ہوتی گئی مگر ہزار جتن لاکھ کوششوں اور دعاؤں کے باوجود میں وہ چند سالوں کا بندھن نہیں توڑ پائی جو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

وہ ادھورا رشتہ تا عمر میرے ساتھ رہا۔ ہر رات ہر لمحہ، ہر دن ہر صبح ہر شام، ہاں یہ الگ بات تھی کہ میں نے اس کے سایہ کو بھی محسوس نہ ہونے دیا۔ ساتھ رہتے رہتے تو دشمن بھی محبت کر بیٹھتے ہیں پھر وہ تو انسان تھا۔ جس کا سب کچھ میرا تھا اور میرا سب کچھ اس کا...... نہیں میں لاکھ چاہنے کے باوجود اپنا سب کچھ اس کو نہیں دے پائی۔ اس کی طرف بڑھتے قدموں کے درمیان کوئی تھا جو ہر بار حائل ہو جاتا تھا۔ اس کی طرف اٹھنے والی نگاہ کے درمیان کوئی نظر تھی جو میری نگاہوں میں چھپ جایا کرتی تھی۔ میری سوچوں میں کوئی تھا جو ہر لمحہ میرے ساتھ سفر کرتا تھا۔ میرا دل سب کچھ ہونے کے باوجود بھی اس کو ٹٹولتا رہا...... آخر وہ کیا رشتہ تھا جس نے عمر بھر مجھے ادھورا رکھا۔ وہ کیا رشتہ تھا جو لمحاتی زندگی رکھنے کے باوجود میری برسا برس کی زندگی پر غالب رہا۔ وہ کون سی انجانی ڈور تھی جو کبھی نہ ٹوٹ پائی۔ جس کے لیے میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دل میں کسک محسوس کرتی رہی۔ جس کا خالی پن میری روح میں خلا پیدا کر گیا۔

اب جب یہ سب سوچتی ہوں تو ایک سوال میرے ذہن میں ناگ کی طرح پھن اٹھاتا ہے۔ کیا میری شادی واقعی شادی تھی؟ جس میں، میں ادھوری روح سے ہمیشہ جڑی رہی۔ جس رشتے کو میرے دل نے کبھی خوش دلی سے قبول نہیں کیا۔ کیا واقعی کامیاب رشتہ اسی کو کہتے ہیں؟

بس صرف یہی وہ تحریر تھی جس نے اب مجھے بے چین کرنا شروع کر دیا تھا اور جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ ایک ایسی عورت جو اپنی تمام عمر خاموشی سے خوشی سے اپنے شوہر کے ساتھ گزار تو گئی مگر تمام عمر ادھوری رہی۔ جس کے ادھورے پن نے بہت سے سوال ذہن میں کھڑے کر دیے۔ ایسے رشتے کو ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ آخر ان کا جواب کہاں ہے......؟

Nusrat Shamsi
Anjuman Street
Rampur-244901(U.P)
Mob: 9045380276

نواب صاحب

پروین طلحہ
مترجم: ڈاکٹر صبیحہ انور

یہ اتوار کی خوشگوار صبح تھی۔ میرا گھر بٹلر پیلس کالونی میں تھا، میں نے ابھی تک نہ ایکسر سائز کی تھی اور نہ ہی غسل کیا تھا۔ ظاہر ہے ابھی ناشتہ کرنا بھی باقی تھا۔ کیدار نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بتایا کہ "نواب صاحب آئے ہیں" جیسے اس وقت نواب صاحب کی آمد میرے لیے غیر متوقع نہ ہو۔ "کون نواب صاحب؟ کہاں سے آئے ہیں۔ بھئی خدا کے لیے۔" میں جھنجلا گئی۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ میری جھنجلاہٹ تو نہیں مگر میرے سوال ضرور بلا وجہ تھے۔ لکھنؤ میں "نواب صاحب" کے لیے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی، ایک نواب بس نواب ہوتا ہے، لکھنؤ میں ایسا نواب بھی ہوسکتا ہے جس کی نہ کوئی ریاست ہوگی نہ املاک، اس حالت میں پیٹھ پیچھے ان کو نواب بے ملک کہا جاتا۔ مگر ان کے منھ پر انھیں وہ ساری عزت دی جاتی جس کا ایک ریاست والا نواب مستحق ہوتا ہے۔

اسی لیے باوجود اپنی جھنجلاہٹ کے میں اٹھی اپنے کو سنبھالا اور بال وغیرہ درست کرکے آئینہ دیکھا اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی جس آدمی سے میرا سامنا ہوا وہ اپنے حلیے سے دور دور سے نواب نہیں نظر آرہا تھا۔ یہ شخص معمولی سا سفاری سوٹ پہنے ہوئے بہت سی فائلوں کے ساتھ ہندی میں بات کرتا ہوا بالکل ویسا ہی تھا جیسے لوگ یوپی سکریٹریٹ کی راہ داریوں میں اکثر نظر آیا کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ شاید کہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا نام نواب ہو۔ ملک کے اس خطے میں یہ بھی ممکن ہے۔ نواب خاندان میں پیدا نہ ہونے پر بھی آپ کا نام نواب ہونا آپ کے محبت کرنے والے والدین کی بدولت ممکن ہے۔ لکھنؤ اور اس کے نواح میں نواب ہر جگہ ملتے ہیں نواب رائے، نواب سنگھ، نواب علی، نوابو وغیرہ وغیرہ۔

لیکن میرے تمام خدشات غلط تھے۔ آج صبح آنے والا یہ شخص براہ راست عالی جناب بادشاہ امجد علی شاہ کے وارثوں میں تھا اور اس کے پاس تمام ضروری تفصیلات اور حوالے موجود تھے اس کا شجرہ، خاندان کے تمام سلسلے اور ثبوت وغیرہ، جو ایک فائل میں بندھے ہوئے اس کی بغل میں دبے تھے اور دوسری فائلوں میں وہ خط و کتابت تھی جو ریاستی حکومت اور اس کے درمیان عرصے سے چل رہی تھی۔ جو اس کے دعویٰ کا ایک بڑا ثبوت اور ریکارڈ بھی تھے۔

اس نے مجھے بتایا کہ طویل قانونی لڑائی اور بحث ومباحثے کے بعد اس کو سبطین آباد امام باڑے اور اس سے ملحقہ جائداد کا قانونی وارث مان لیا گیا ہے۔ مقبرہ کا علاقہ بادشاہ امجد علی شاہ کی آخری آرام گاہ ہے اور حضرت گنج کا ایک حصہ بھی ہے۔

"تو اب تو آپ دوبارہ رئیس ہوگئے ہیں"۔ "الحمد للہ۔ محترمہ خدا آپ کی عمر دراز کرے عالی جناب کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اگر سچ ہوجائیں تو آپ کا یہ ناچیز خادم آپ کا منھ گھی شکر سے بھرے گا لیکن جیسے آج کل کے حالات ہیں میں اس معاملے میں تو یہی کہوں گا کہ آپ کا یہ ناچیز خادم ویسا ہی غریب ہے جیسا کہ وہ تھا۔" جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ سکریٹریٹ کی زبان نہیں تھی بلکہ اس کی موروثی اور بزرگوں کی زبان تھی۔

نواب صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ تشریف لائے کیا کوئی خاص کام ہے کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت اٹھائی؟ میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں اور کیا آپ مجھ سے واقف ہیں؟ میں یہ جاننا چاہتی

تھی کہ وہ دراصل کیا چاہتے ہیں؟ اور ان کے یہاں آنے کی کیا وجہ ہے؟ اور آخر وہ ہیں کون وغیرہ وغیرہ۔ ''غریب پرور لکھنؤ میں ایسا کون ہے جو آپ جیسی باعزت ممتاز شخصیت کو نہیں جانتا ہے۔ آپ کی شخصیت کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے آپ کا دل موم کی طرح نرم ہے جو ایک حقیر چیونٹی کو بھی تکلیف میں دیکھ کر پگھل جاتا ہے آپ کا یہ ناچیز غلام آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر آیا ہے۔'' وہ میری طرف بڑی امید افزا نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میرا دل چاہا وہ اسی طرح بولتے رہیں اپنے بارے میں سننا کے اچھا نہیں لگتا۔

''نواب صاحب یہ بتایئے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں'' مجھے معلوم تھا کہ میں اپنے آپ کو ایک بڑی مصیبت میں گرفتار کر رہی ہوں، لیکن اس کے باوجود میں ان کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اپنی تعریف اور خودستائی، چھوٹی سی خوشامدانہ تقریر سے میں خود کو ان کا شکر گزار محسوس کر رہی تھی۔

''محترمہ'' نواب صاحب نے کہا ''میں ایک غریب آدمی ہوں جس کے رسوخ ہیں نہ رابطے۔ لکھنؤ ڈیولپمنٹ اتھارٹی ابھی تک امام باڑہ سبطین آباد کی مالک ہے اور میرے لیے اس کی ملکیت اور اس پر قبضہ بہت مشکل ہے اور اپنی بات ثابت کرنے کے لیے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ آپ گورنمنٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ کیا آپ اپنے اثرات استعمال کر کے دو لفظ میری مدد کے لیے نہ کہیں گی۔'' میں نے اندازہ لگایا انھوں نے مجھے اپنی باتوں میں الجھا لیا تھا اور اب وہ بہت دور کی سوچ رہے تھے۔ میں آسانی سے سرکاری افسران والا جواب دے کر اس سے بچ سکتی تھی کہ میرا ایل ڈی اے میں کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ میں اچھا سا جواب دینے ہی والی تھی اسی وقت کیدار کمرے میں ایک نجات دہندہ کی طرح داخل ہوا۔ اس نے مجھے ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع دے کر بچا لیا۔

میں نے نواب صاحب سے صبح کے ناشتے کی پیش کش کی جسے انھوں نے بڑی ملائمیت اور نرمی سے منع کر دیا۔ میرے بہت اصرار پر وہ ایک پیالی چائے پینے پر راضی ہو گئے میں نے دیکھا انھوں نے چائے کی پیالی ایک خاص انداز سے اٹھا رکھی تھی۔ وہ تکلف سے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے چائے کو صرف اپنے ہونٹوں سے چکھ رہے تھے بڑے خوبصورت انداز میں تعریفی کلمات کہہ رہے تھے اور مجھ پر اپنی دعائیں نچھاور کر رہے تھے ''جیتی رہیے، خوش رہیے۔'' ان کو اصل بات سمجھانے کے میرے سارے دلائل اور کوششیں ناکام رہیں۔ وہ کچھ زیادہ ہی مطمئن اور پرامید نظر آرہے تھے۔

ان کی مدد کرنے کی میری خواہش اور زیادہ شدید ہو گئی۔ ایک آدمی جس نے بغیر کسی مدد کے اپنی آدھی زندگی قانون کے دروازے کھٹکھٹانے میں گزار دی تھی اس وقت وہ مدد کا مستحق تھا۔ یقیناً ان کوششوں میں ان کا بہت روپیہ بھی خرچ ہوا ہوگا۔ مگر یہ روپے ان کے پاس آئے کہاں سے۔ مجھے یہ جاننے کا تجسس تھا مگر پوچھتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اس کے بجائے میں نے ان سے ان کا پتہ پوچھا۔

''رہنے دیجیے محترمہ وہ کہنے لگے میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میرا کوئی پتہ نہیں ہے۔'' میں نے اصرار نہیں کیا۔ بہت سے رخصتی کلمات اور شکریے کے بعد وہ چلے گئے۔

ایک اور اتوار کی صبح اس سے پہلے کہ جون کا سورج اپنا قہر برسانا شروع کرتا۔ نواب صاحب نے میرے دروازے پر دستک دی۔ اس بار ان کے بغل میں فائلوں کی جگہ کتابیں دبی ہوئی تھیں۔

''پچھلی بار میں نے اندازہ لگایا کہ آپ کو لکھنؤ کے نوابی دور کی تاریخ میں بہت دلچسپی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کتابوں سے آپ کو ضرور مدد ملے گی۔'' انھوں نے وہ کتابیں میرے سامنے میز پر پھیلا دیں۔ ان میں لکھنؤ کے بارے میں چند بہت نایاب کتابیں تھیں۔

''میں یہ کتابیں آپ کو کب واپس کروں اور کہاں واپس کروں؟'' میں نے پوچھا۔ ان کتابوں کو دیکھ کر میں واقعی بہت خوش تھی۔

''ان کو پڑھنے میں آپ کو کتنا وقت لگے گا محترمہ۔''

''ایک مہینہ''

''اگر آپ چاہیں تو آپ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔''

''ہمیشہ کے لیے نہیں۔ ایک مہینہ ہی کافی ہوگا''۔ میں نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں اسی طرح اتوار کو ہی آؤں گا۔ ایک مہینے بعد''

''نواب صاحب میں آپ کو بہت زحمت میں مبتلا کر رہی ہوں۔ مجھے اجازت دیں کہ میں خود آ کر یہ کتابیں آپ کو لوٹا دوں''

''کوئی زحمت نہیں محترمہ'' یہ میرے لیے عین خوشی ہوگی'' انھوں نے اس طرح کہا جیسے وہ اس بات کو مزید طول نہیں دینا چاہتے ہیں اور رخصت ہو گئے۔

تین مہینے سے زیادہ گذر گئے نواب صاحب کتابیں واپس لینے نہ آئے۔ میں نے نواب صاحب کے بارے میں معلوم کیا۔ بہت سے لوگ ان کو جانتے تھے۔ لیکن کسی کو یہ نہ معلوم تھا کہ ان کی رہائش کہاں ہے۔ آخر میں مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ وثیقہ آفس۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں اودھ کے

حکمرانوں کے وارثوں کو پنشن ملتی تھی۔ وہاں سے یقیناً ان کے بارے میں پتہ چل سکتا ہے۔ میں صحیح تھی۔ آفس سے مجھے ان کے سلسلے میں معلومات مل گئیں اور وہیں ان کا پتہ بھی مل گیا۔ وہ کاظمین کے قریب رہتے تھے۔

کاظمین کے ایک گیٹ کے پاس میں نے اپنی گاڑی پارک کروا دی۔ ایک چھوٹے لڑکے نے مجھے گھر کا راستہ دکھایا۔ گھر کیا تھا ایک کمزور سا ڈھانچہ تھا بھربھری دیواریں۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ پردے کے ایک سوراخ سے میں نے بیگم صاحب سے بات کی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ نواب صاحب کام پر گئے ہیں۔

اسی چھوٹے لڑکے نے اس جگہ تک میری رہنمائی کی جہاں نواب صاحب کام کرتے تھے راستے میں اس لڑکے نے بتایا کہ وہ زردوزی کے کاری گر ہیں اور ایک کارخانے میں کام کرتے ہیں جو کسی اور کی ملکیت ہے۔ جب میں وہاں پہنچی اس لڑکے نے ایک چھوٹے سے گھر کی طرف انگلی اٹھائی، میں وہیں رک کر اس طرف دیکھنے لگی۔ نواب صاحب کو پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ حالانکہ اس وقت وہ اس لباس میں نہیں تھے جس لباس میں میں ان سے ملی تھی۔ ان کی کمر کے گرد ایک تہبند لپٹی ہوئی تھی۔ ان کی پشت پر قمیض نہ تھی۔ وہ لکڑی کے اڈے پر جھکے ہوئے تھے لکڑی کے اڈے کے بیچ میں عنابی رنگ کا مخمل کا ٹکڑا تنا ہوا تھا۔ بہت سے دوسرے کاریگر جن میں بچے بھی تھے اسی طرح کپڑے پر جھکے ہوئے تھے۔ نواب صاحب کی ننگی پیٹھ پسینے سے چمک رہی تھی اور انگلیاں کپڑے سے سوئی کو بڑی مہارت سے باہر کھینچ رہی تھیں جو اپنے پیچھے ایک سنہری لکیر چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

نواب صاحب کو اس وقت کپڑے اور سنہری تاروں کے علاوہ کوئی احساس نہ تھا میں نے فیصلہ کیا کہ حکمرانوں کی اولاد کی محویت اور انہماک میں اس وقت مخل ہونا مناسب نہ ہوگا۔

مجھے یقین ہے کہ وہ ایک دن پھر میرے فلیٹ پر آئیں گے کسی اتوار کی صبح اپنی کتابیں واپس لینے کے لیے یا شاید یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کیا میں نے ان کے کام کے سلسلے میں حکام سے کوئی بات کی تاکہ ان کو اپنے آبا کی جائیداد پر مالکانہ حقوق مل سکیں۔

(ماخوذ از فدائے لکھنؤ' قومی اردو کونسل)

فرہنگ آصفیہ سے

اِمام ضامن۔ ع۔ اسم مذکر۔ یہ حضرت سیدنا علی رضا ابن موسیٰ الکاظم کا جو آٹھویں امام ہیں عرف ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے آپ کو امام ثامن بھی کہتے ہیں آپ ایک سو اڑتالیس ہجری میں بمقام مدینہ منورہ پیدا ہوئے۔ آپ کی کنیت ابوالحسن ہے اور القاب رضا۔ صابر۔ زکی۔ ولی ہے آپ خلفائے عباسی میں سے خلیفہ مامون بن ہارون رشید کے زمانہ میں موجود تھے۔ خلیفہ مذکور نے اپنی ایک خاص منت پوری ہو جانے کے سبب اپنا خلیفہ قرار دیکر اپنی بیٹی مسماۃ ام حبیب سے ۲۰۲ھ میں نکاح کر دیا تھا۔ کیونکہ اسی زمانہ میں خلیفہ وقت نے کربلائے معلیٰ جانے کی سخت پابندیاں بمنزلہ ممانعت کردی تھیں پس آپ وہاں جانے والوں کے کفیل و ضامن ہو جایا کرتے تھے۔ تاکہ زائرین ثواب زیارت سے محروم نہ رہیں پس اس وجہ سے آپ کو امام ضامن کہنے لگے۔ تاریخ الائمہ ایک امامیہ مذہب کی کتاب میں درج ہے کہ آپ جس طرح خلق اللہ کی بخشش کے ضامن ہیں اسی طرح حیوانات کے بھی بعض اوقات صیادوں سے ضامن ہو گئے ہیں۔ چنانچہ کتاب مذکورہ میں آہو و صیاد وغیرہ کا قصہ لکھ کر اس امر کی تصدیق کی ہے۔ لہذا بوجوہ بالا مستورات اہل اسلام کا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ جب کوئی سفر کو سدھارے یا کہیں بیاہ خواہ منگنی ٹھیرائی جائے اور امام صاحب کے نام کا روپیہ پیسہ خواہ اشرفی یا کوئی سکہ بازو پر باندھا جائے تو آپ مراد پر پہنچانے کے ضامن ہو جاتے ہیں۔ جس وقت مسافر منزل مقصود پر پہنچتا یا وہ کام ہو جاتا ہے تو اس رقم کو سیدوں پر تقسیم کر دیتے ہیں۔ غرض آپ ۵۵ برس زندہ رہے اور آخر صفر ۲۰۳ھ میں زہر ملے انگوروں کے از جانب خلیفہ کھلائے جانے سے رحلت فرمائے عالم قدس ہوئے۔ اس موت کی آپ نے پہلے سے پیشین گوئی کر دی تھی۔ آپ کا مزار پر انوار شہر طوس واقع خراسان متصل قبر ہارون رشید ہے۔

آنکھوں کے ناخون تو لو یا لواؤ۔ محاورہ (پورب) ذرا آنکھ کا پردہ تو اٹھاؤ۔ غفلت تو دور کرو۔ نرے اندھے نہ بنو۔ آنکھوں کو درست کرکے دیکھو۔ کچھ پرکھ پیدا کرو۔ آنکھیں بنواؤ۔ شناخت سیکھو۔ شناخت پیدا کرو۔ (جب کوئی برا ہو کا یار یا کم رتبہ آدمی کسی اچھی چیز کو برا بتاتا یا کسی عمدہ چیز کی قیمت اسکی حیثیت سے بہت کم لگاتا ہے۔ تو اس حالت میں یہ محاورہ طنزاً کہتے ہیں۔ چونکہ آنکھ میں ناخن کوئی شئے نہیں ہے۔ اس سبب سے شاید یہاں ناخون مجاز آناخنہ ہو جو ایک سفیدی آنکھ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بڑھتے بڑھتے آدمی کو اندھا کر دیتی ہے۔ یا بڑی بڑی پلکیں۔ مگر اول وجہ قوی ہے اور دوسری ضعیف

فرحین ناز

دو آنکھ

'امی آپ دو آنکھ دیکھتی ہیں' ہمیشہ کی طرح نادرہ نے وہی جملہ کہا جو کہ سلمہ فرید کے دل کو چھلنی کیے دیتا تھا۔

'آپ صرف شہزادی سے پیار کرتی ہیں جیسے میں تو آپ کی بیٹی ہوں ہی نہیں' نادرہ نے بات آگے بڑھائی۔

'دیکھو نادرہ ایسی کوئی بات نہیں تم دونوں ہی میری نظروں میں برابر ہو' سلمہ بولی۔

پھر جب آپ مال گئی تھیں تو میرے لیے کچھ لے آتی نا، ایک آدھ سڑی سی لپ اسٹک ہی سہی یا پھر گھڑی یا کچھ اور لیکن آپ میرے لیے کیوں کچھ لانے لگی؟ آپ تو گئی تھیں اپنے لاڈلے کی شرٹ خریدنے۔

'بیٹا! ایسا کچھ بھی نہیں ہے میں تمھارے لیے بھی کچھ لینے کی نیت رکھتی تھی لیکن نقدی (cash) تھوڑی تھی اور میں ATM Card لے جانا بھول گئی تھی۔'

'بس، اب آپ صفائی دینا بند کریں۔ میرے کان پک گئے ہیں یہ جھوٹ سن سن کر آپ قبول کیوں نہیں کر لیتی کہ آپ صرف شہزادی کو اپنی اولاد سمجھتی ہیں' نادرہ اونچی آواز میں بولی۔

'نہیں یہ سچ نہیں ہے' سلمہ کی آواز بھرا گئی۔

'یہی سچ ہے' نادرہ چیخی' آپ دو آنکھ دیکھتی ہیں دو آنکھ' کہتی ہوئی نادرہ دروازے سے باہر نکل گئی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ سلمہ کی آنکھوں میں چمچماتے ہوئے آنسو نہ دیکھ سکی' سنو تو سہی' اسے باہر بھی اپنی ماں کی آواز سنائی دی لیکن اس نے دھیان نہ دیا دل میں سوچا' آفس جانے میں پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے اور ابھی میرا وقت ضائع کرنے کا کوئی موڈ نہیں ہے بائی بائی امی'۔

نادرہ اور شہزاد سلمہ فرید کی دو اولادیں تھیں۔ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا شہزاد ملنسار اور بردبار تو نادرہ بہت ضدی تھی ان کے والد فرید احمد ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے جن کے انتقال کو تقریباً چھ سال گزر چکے تھے ان کی پینشن اب بھی ملتی تھی شہزاد اور نادرہ دونوں ہی جاب کیا کرتے تھے۔ سب کچھ تھا لیکن زندگی میں سکون نہ تھا اور اس کی وجہ تھی نادرہ کی بدمزاجی وہ نفسیاتی طور پر اپنی ماں کو اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرنے لگی تھی اسے لگتا تھا کہ اس کی ماں اس سے پیار نہیں کرتی جس کے نتیجے میں وہ ماں سے ایسی ایسی باتیں کہہ جاتی جو ماں کے معصوم دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی۔

گھر سے نکل کر نادرہ نے ایک ٹیکسی لی اور آفس کی جانب روانہ ہو گئی سارا راستہ وہ صرف یہی سوچتی رہی تھی کہ ماں نے اپنی دونوں اولادوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ بچپن ہی سے دیکھتی آ رہی ہوں وہ صرف شہزاد شہزادی کی رٹ لگائے رہتی ہے بھلا کیوں انھیں شہزاد اتنا بھاتا ہے۔ مجھ میں کیا کمی ہے جو ماں مجھ سے پیار نہیں کرتی؟ ہاں ہاں ماں مجھ سے پیار نہیں کرتی' آخری جملہ اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا اس کے ذہن میں یہی جملہ گردش کرنے لگا 'ماں مجھ سے پیار نہیں کرتی...... ماں مجھ سے پیار نہیں کرتی' وہ رونے لگی پھر احساس ہوا کہ ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی ہے جلدی جلدی آنکھیں خشک کی اور پرسکون ہونے کی کوشش کرنے لگی تھوڑی دیر خاموشی کے بعد پھر سے ذہن پر خیالات کی یلغار ہونے لگی۔

'ہاں یہ تو سچ ہے کہ ماں مجھ سے پیار نہیں کرتی' اس بار وہ منہ ہی

بڑبڑائی پھر سوچنے لگی بچپن میں جب کبھی ہم دونوں میں لڑائی ہوتی تھی تو ماں مجھ کو ہی ڈانٹتی تھی اور ہاں ایک بار جب میں نے ذرا سا شہزاد کو مار دیا تھا تو ماں نے میری پٹائی کر کے رکھ دی تھی، ابو جب ہیڈ ماسٹر بنے تھے تو انھوں نے شہزاد کے لیے کوٹ سلوایا تھا اور میرے لیے ...... ہونہہ ...... دو ٹکے کی معمولی فراک، خاص خاص موقعوں پر کھانا بھی شہزاد کی پسند کا بناتی تھیں اور جب بقرعید پر میں نے ذرا سی حلوے کی فرمائش کر دی تھی تو ماں کتنا غصہ ہوئی تھیں...... آخر ماں ایسا کیوں کرتی ہے؟ آخر کیوں؟...... کیا سبھی مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں...... کتنا برا لگتا ہے کہ وہ مجھے اہمیت نہیں دیتیں، گویا میری زندگی ان کے لیے بوجھ ہے اسی لیے وہ میری قدر نہیں کرتی' ٹیکسی رک گئی اس کی سوچ کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا اس نے ٹیکسی سے اتر کر کرایا ادا کیا اور دندناتی ہوئی آفس کی عمارت کی جانب بڑھ گئی۔

آفس آنے کے آدھا گھنٹہ بعد اسے تھوڑی فرصت نصیب ہوتی تو ماں سے کہے ہوئے الفاظ اسے پھر یاد آئے 'ماں آپ دو آنکھ دیکھتی ہیں' سے اسے اس جملے پر ذرا بھی افسوس نہ تھا اس نے سوچا کہ میں نے صحیح تو کہا۔ ماں دو آنکھ دیکھتی ہے ان کی نظر میں شہزاد اہمیت رکھتا ہے نادرہ نہیں......'

ٹرررٹرررتبھی اس کا موبائل فون بج اٹھا اس نے دیکھا، شہزاد کا فون تھا' کیا مصیبت ہے،' وہ آہستہ سے بڑبڑائی اور برا سا منہ بنا کر کال ریسیو کی' کیا بات ہے؟' وہ فون پر غرائی

'نادرہ باجی! جلدی سے سٹی اسپتال پہنچیے' دوسری طرف شہزاد بولا

'کیوں؟ کیا ہو گیا؟' اس نے پوچھا

'امی .... امی کی حالت بہت نازک ہے' شہزاد کی روہانسی آواز آئی۔

'کیوں؟ امی کو کیا ہوا' نادرہ نے پوچھا۔

'پتہ نہیں' شہزاد نے کہا' ہماری نوکرانی کا فون آیا تھا وہ گھبرائی ہوئی تھی اس لیے پوری بات نہ بتا سکی اس نے صرف اتنا کہا کہ ماں کو اس نے پڑوسیوں کی مدد سے اسپتال میں پہنچا دیا ہے اور اب ڈاکٹر علاج میں جٹے ہیں'۔

ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گی۔

'ٹھیک ہے خدا حافظ' شہزاد بولا

نادرہ نے کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اسپتال میں شہزاد پہلے ہی سے موجود تھا اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا نادرہ سیدھی امی کے پاس گئی، پوچھا' کیا ہوا ہے امی کو'۔

شہزاد نے خالی خالی نگاہوں سے نادرہ کی جانب دیکھا اور کہا' میں نے چھری سے اپنی ایک آنکھ پھوڑ لی ہے'۔

'کیا! نادرہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی'۔

شہزاد نے ایک چٹھی نادرہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا' ماں نے یہ آپ کے لیے لکھا ہے'

نادرہ نے دیکھا پورے کاغذ پر صرف دو سطریں لکھی ہوئی تھی اوپر تحریر تھا' اب میں تم دونوں کو بھی دو آنکھ نہ دیکھ سکوں گی' اور آخر میں I Love You Nadera' لکھا ہوا تھا نادرہ کا ذہن سن ہو گیا پھر اس کا جسم لہرا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا اس کی سانسیں چل رہی تھیں وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

Farheen Naaz Ghulam Rabbani

Akbar Chowk, Gali No.02

H. No. 3201

Dhule-424001(M.S)

فرہنگ آصفیہ سے

بلقیس ۔ ع۔ اسم مؤنث۔ سبا واقع ملک عرب کی ملکہ اور حضرت سلیمان کی ہم عصر۔ یہ ملکہ جو شماسہ اور کافرہ تھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہم عصر تھی۔ آپ اس زمانہ میں سر زمین شام کے خدا پرست بادشاہ تھے۔ فریقین ایک دوسرے کے حالات سنتے رہتے تھے۔ اخیر کو سفارتی تعلقات بڑھے۔ ایک مرتبہ بلقیس خود حضرت کی ملاقات کو آئی۔ حضرت کی خدا پرستی کا جلال دیکھ کر حیرت میں ہو گئی۔ کچھ دنوں مہمان رہ کر اپنے سابقہ عقاید سے تائب اور حضرت کی حسب شریعت بیوی ہوئی۔ جنوبی افریقہ میں شہر تدمور اسی کی یادگار بتاتے ہیں۔ ولید کو اس کی قبر کا پتہ لگا تھا جس کے تعویذ پر ملکہ سبا کندہ تھا مگر خلیفہ مذکور نے اسے خاک خاک ڈال کر پوشیدہ کرا دیا۔ بعض مورخوں کا بیان ہے کہ آپ نے خود نکاح نہیں کیا ملک تبع اصغر سے کرا دیا تھا جس سے اولاد بھی ہوئی۔ چونکہ وہ مسلمان ہو گئی تھی اس وجہ سے اہل اسلام کی مستورات کا نام بھی بلقیس زمانی، بلقیس جہاں وغیرہ ہونے لگا۔

مہ جبیں غزال

میں گڑیا ہوں

نظم

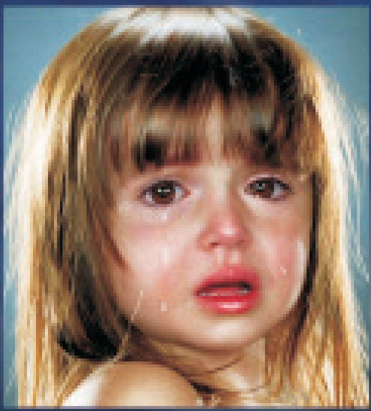

میں گڑیا ہوں
میں اپنی ماں کی گودی کی ہوں ٹھنڈک
بابو کی دُلاری ہوں

میرا بھیا کھلونا چھیننا چاہے تو
دادی سے لپٹ کر
خوب ہنستی اور ہنساتی ہوں

یہ گھر آنگن مہکتا ہے
میری باتوں کی کلیوں سے
آنگن بھی مسکراتا ہے
مری تالی کی تانوں سے

میں گڑیا ہوں
دوپٹے کی ضرورت کو
ابھی سے میں کہاں جانوں
میرا اپنا پرایا کون ہے
میں کیسے پہچانوں

میں گڑیا ہوں
مگر کوئی
مرے کپڑوں کا دشمن ہے
یہ کس نے کوکھ میں تیزاب کا خنجر اتارا ہے
پچھلی آنکھوں کو میری
خون سے تر کر دیا کس نے

میرے گالوں پہ تھپڑ
بے تحاشہ جڑ دیا کس نے
میں رونا چاہوں تو
ہونٹوں کو میرے
کس نے کاٹا ہے

میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے
یوں کس نے ڈانٹا ہے
یہ کس کی وحشی آنکھوں میں
جہنم جیسے شعلے ہیں
ٹپکتی رال ہے منہ سے
یہ چہرے کتنے گندے ہیں

میرے تن من سے
ہولی خون کی یوں کس نے کھیلی ہے
وہ دیکھو
بے طرح روتی ہوئی میری کلی ہے

میں بے سدھ سی پڑی ہوں
ڈاکٹر اور نرس حیراں ہیں
میری حالت پہ
ماں غش کھا رہی ہے
دادی، بابو اور بھیا بھی پریشاں ہیں

میری نس نس میں یوں
یہ سوئیاں کس نے چبھو دی ہیں
میرے کنبے کے اک اک فرد کی آنکھوں بھگو دی ہیں

میرا آنگن سے رشتہ
ختم سمجھو چار برسوں کا
گگن ہی اب میرا مسکن ہے گا
چاند تاروں کا

میں گڑیا ہوں
چلو اب کھیلتے ہیں کھیل
دلہن کی وداعی کا
محبت سے گلے ملتے ہیں
پل ہے یہ جدائی کا
مگر ڈولی نہیں بلکہ سجا رہا چتا میری

میں گڑیا ہوں
میں اپنی ماں کی گودی کی ہوں ٹھنڈک
بابو کی دُلاری ہوں..........!!
میں گڑیا ہوں......!!

Dr. Mah Jabeen Ghazaal
Banglore University
No. R-6, Manas Gangotri
Mysore-570006-(K.S)

ماں میں تیرے جیسی ہوں

نظم

ماں میں تیرے جیسی ہوں
درد کو چھپاتی ہوں
سب کا غم بٹاتی ہوں
زندگی کے طوفاں سے
روز جنگ کرتی ہوں
پھر بھی ہنستی رہتی ہوں
کتنا صبر کرتی ہوں
ماں میں تیرے جیسی ہوں

آس میں خوشی کی میں
سب غموں کو پی جاؤں
سوچتی ہوں اک دن تو
آئے گا کوئی لمحہ
جب سنور کے ابھرے گا
تارہ میری قسمت کا
سوچتی ہوں میں اکثر
ماں میں تیرے جیسی ہوں

لوگ مجھ سے کہتے ہیں
تو جدا ہوئی مجھ سے
میں بچھڑ گئی تجھ سے
پر میں جانتی ہوں تو
مجھ میں منتقل ہو کر
آج مجھ میں زندہ ہے
مجھ سے سب یہ کہتے ہیں

ماں میں تیرے جیسی ہوں
ہاں میں تیرے جیسی ہوں

قمر سرور

غزل

کہیں ملے جو وہ پاگل، اسے دکھا دینا
اسی نے دی ہے یہ پاگل، اسے دکھا دینا

کہیں کہیں پہ ابھی تک، مری زمین ہے خشک
برسنا چاہے جو بادل اسے دکھا دینا

میں کیا کروں کہ وفاؤں کا ہو یقیں اس کو
یہ میرے اشک یہ کاجل اسے دکھا دینا

اُسے خبر تو ہو، اس دل میں شہر تھا پہلے
ہمارے بعد یہ جنگل، اُسے دکھا دینا

اُسی نے جھیل میں پھینکا تھا ایک دن کنکر
جو میرے دل میں ہے ہلچل اُسے دکھا دینا

ہوئی ہے رات بہت، اے سرورؔ سو جاؤ
جو زخم رہ گئے اب کل، اسے دکھا دینا

Dr. Qamar Suroor
Editor- Makhdoom
3588, Manik Chowk
Ahmad Nagar-414001 (M.S)

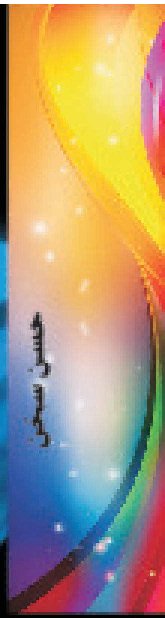

غزلیں

ہاجرہ نور زریاب

یارب دیا ہے حسن تو یہ بھی کمال دے
میں ہنس پڑوں تو پھول کی خوشبو اچھال دے

انداز میری پیاس کا جانے گا کوئی کیا
چاہوں تو اک پہاڑ بھی چشمہ نکال دے

ہستی تو نیستی میں بدل جائے گی مگر
ایمان مجھ کو میرے خدا لازوال دے

ماں کی دعائیں ساتھ میں رکھتی ہوں اس لیے
جو بھی بلائیں آئیں اسے سر سے ٹال دے

شاید وہ میرے فن کو سمجھنے لگا ابھی
ورنہ وہ ایسا کب تھا کہ آنسو نکال دے

کیسا عجیب دوست ہے جب بھی ملوں اسے
میرے ہی سامنے مجھے میری مثال دے

زریاب مانگتی ہے دعا اے مرے خدا
جب بھی قلم اٹھاؤں انوکھا خیال دے

Hajra Noor Zaryab
Ganga Nagar
Near Modem English School
Akolo-444002 (M.S)
Mob: 9922318742

شہناز فاطمہ صدیقی

اس کی آنکھوں کی بے زبانی کا
رقص دیکھا ہے میں نے پانی کا

آپ مجھ کو بھلا نہیں سکتے
ایسا کردار ہوں کہانی کا

دل میں رکھا نہیں کرو کچھ بھی
کیا بھروسہ حیاتِ فانی کا!!

ہم سفر ہم مزاج ہو تو کٹے
سخت رستہ بھی زندگانی کا

جو ضعیفوں کے کام آ نہ سکے
فائدہ کیا ہے اس جوانی کا

Shahnaz Fatima Siddiqui
D-293/57, Old Haider Ganj
Lakarmandi
Lucknow-226003 (U.P)

لذیذ پکوان

ہر موسم کا اپنا الگ مزہ ہے۔ بدلتے موسم کے ساتھ پہننے اوڑھنے اور رہن سہن کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی عادات بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سردیوں کے مخصوص کھانے آپ کو سردی کے اثرات سے بچاتے ہیں۔ سردیوں میں یہ مزیدار ڈشیں بنائیں اور ذائقہ کے ساتھ ساتھ بھرپور توانائی بھی حاصل کریں۔

1۔ باجرے کی ٹکیاں

سردیوں میں ضرور بنائیں۔ ایک پاؤ دودھ میں آدھا کپ گڑ میلٹ کر لیں۔ ایک پاؤ باجرے کا آٹا لیں اور اسی دودھ کو تھوڑا تھوڑا شامل کر کے اچھی طرح گوندھ کر آدھے گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ اسکے بعد

ٹکیاں بنا کر سفید تل سے کوٹ کریں اور ہلکے گرم تیل میں درمیانی آنچ پر تل لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر آپ اسے ایئر ٹائٹ جار میں محفوظ کر سکتی ہیں۔

2۔ مولی کی ترکاری

سردی کی سوغات مولی جسے سلاد کے طور پر کھائیں یا پکا کر ہر طرح سے مفید اور ذائقہ دار لگتی ہے۔ مولی کو پتوں کے ساتھ کاٹ کر تھوڑے سے تیل میں لہسن اور ثابت لال مرچ ڈال کر مولی ڈالیں ہلکا سا بھونیں اور کٹی لال مرچ اور نمک ڈال کر تھوڑا سا پانی شامل کر کے پکنے رکھ دیں۔ پانی خشک ہونے پر بھون کر گرما گرم چپاتی کے ساتھ سرو کریں۔

3۔ لہسن کی کھچڑی

سردیوں میں مارکیٹ میں ہرا لہسن دستیاب ہوتا ہے۔ آپ گھر میں کسی بھی دال کے ملاپ سے کھچڑی تیار کر کے اسے لہسن کے ہرے حصے کو کاٹ کر گھی میں پہلے زیرہ ڈال کر اسکے بعد کٹا ہوا لہسن شامل کریں اور کھچڑی پر ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔

4۔ گڑ والے چاول

گڑ والے چاول سردیوں کی منفرد ڈش ہے۔ ایک کپ چاول ابال لیں۔ الگ پین میں تھوڑے سے پانی میں ایک کپ گڑ، دو الائچی اور دو لونگیں ڈالکر شیرہ بنالیں۔ جب شیرہ تیار ہو جائے تو دو چمچ گھی شامل کر کے ابلے ہوئے چاول ڈالکر ایک چٹکی نمک چھڑک کر دم لگا دیں۔

5۔انڈوں کا حلوہ

سردیوں سے بچنے کے لئے آپ اس حلوہ کا استعمال کریں۔

انڈے چھ عدد، کھویا ایک پاؤ، دیسی گھی چار چمچے، چینی حسب ضرورت، پسی الائچی آدھا چمچ، سوجی آدھا پاؤ، بادام، پستے اور کشمش بیس بیس گرام، جائفل جاوتری ایک چٹکی ان تمام اجزا کو کھلے پین میں مکس کرکے چولہے پر ہلکی آنچ پر رکھ دیں۔ مستقل چمچ چلاتی رہیں تاکہ تمام اجزا اچھی طرح مکس ہوجائیں۔ آخر میں ایک چٹکی زردے کا رنگ ملا کر اچھی طرح بھون لیں۔

سبزیوں کے کباب

ترکیب: آلو کو خوب ابال لیں خیال رکھیں کہ آلو میں نمی نہ ہو ورنہ کباب ٹوٹنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ بند گوبھی، گاجر، مٹر اور سیم کی پھلی کو علیحدہ ابالیں اور خشک کرنے کے لئے ٹشو پیپر پر پھیلا دیں۔

اب آلوؤں میں ابلی سبزیاں اور باریک کٹی سبزیاں (ہری پیاز، بند گوبھی، شملہ مرچ اور ہری مرچ) شامل کرلیں، سبزیوں کو ہاتھ سے اچھی طرح مکس کریں اب اس میں سوئٹ کارن، کالی مرچ، گرم مصالحہ، بھنا کٹا زیرہ، بھنا کٹا دھنیا، مسٹرڈ پیسٹ، لہسن ادرک کا پیسٹ، باربی کیو سوس، نمک اور کارن فلاور شامل کرلیں۔

تمام اجزاء کو یکجا کرنے کے لئے ہاتھ سے یا پوٹیٹو میشر سے مکس کرلیں۔ اور گول کباب بنا کر رکھتے جائیں۔ الگ پیالے میں انڈے پھینٹ کر اس میں نمک ملالیں۔ اب تمام کبابوں کو انڈے میں ڈپ کر کے بریڈ کرمبز لگاتے جائیں، کباب بنا کر تھوڑی دیر کے لئے فریج میں رکھیں پھر فرائنگ پین میں شیلو فرائی کریں۔

سبزیوں کے کباب کے اس مکسچر میں سخت ابلے انڈے یا ابلی اور کچلی میکرونی یا نوڈلز بھی شامل کئے جاسکتے ہیں یا کوئی چیز ڈال کر بھی سیخوں پر لگا کر کباب بنائے جاسکتے ہیں۔

مغلئی پلاؤ

ترکیب: 1۔ گوشت پر لیموں کا رس اور نمک مصالحہ ڈالکر اچھی طرح ملالیں اور 2 سے 3 گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔

2۔ ایک فرائنگ پین میں ایک کھانے کا چمچ گھی یا تیل ڈالکر گرم کریں اور اس میں کشمش، بادام، پستہ اور کاجو ڈال کر 2 منٹ تک تلیں۔ پھر نکال کر ایک الگ رکھ دیں۔

3۔ ایک کھلے برتن میں پون کپ گھی ڈال کر گرم کریں پھر اس میں میرینیٹ کی ہوئی چکن ڈالکر اتنی دیر تک بھونیں کہ اس کی رنگت تبدیل ہو جائے اور آدھا گل جائے۔ اب اس گوشت کو نکال کر الگ رکھ دیں۔

4۔ اسی گھی میں پیاز ڈال کر ہلکی براؤن (گولڈن) ہونے تک تلیں۔

5۔ پھر اس میں لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر کچھ سیکنڈ بھونیں۔ اب اس میں زیرہ، سونف، دھنیہ، نمک، تیز پات، دار چینی، لونگ، کالی مرچ، چھوٹی الائچی اور بڑی الائچی ڈال کر 4 سے 5 منٹ کے لئے بھونیں۔

6۔ اس مصالحے میں بھیگے ہوئے چاول ڈالیں اور اچھی طرح ملائیں۔ اوپر سے 6 کپ یا حسب ضرورت پانی ڈال کر تلا ہوا چکن بھی ڈال دیں اور ڈھک کر تیز آنچ پر 10 منٹ یا (جب تک پانی خشک ہو) پکائیں۔

7۔ پانی خشک ہو جائے تو آنچ ہلکی کر دیں اور چاول مکس کر کے اوپر سے تلے ہوئے میوے ڈال کر ۱۰ منٹ کے لئے دم پر رکھ دیں۔ لیجئے پلاؤ تیار ہے۔

معلومات صحت وتندرستی

سنگترہ ذائقہ کے ساتھ ساتھ فوائد سے بھی بھرپور

سنگترے کا رنگ سرخ زردی مائل اور ذائقہ چاشنی دار شیریں ہوتا ہے۔ بعض سنگترے ترش اور شیریں ہوتے ہیں۔ ان کا مزاج سرد تر تیسرے درجے میں ہوتا ہے۔ اس کی مقدار خوراک تین سے پانچ عدد ہے۔ اس کے کئی فوائد ہیں۔ سنگترہ دل کو تقویت دیتا ہے۔ سنگترہ مفرح ہوتا ہے اور پیاس کی شدت کو کم کرتا ہے۔ جسم کی حرارت کو دور کرتا ہے۔ اس کا چھلکا خشک کر کے مختلف ابٹنوں کے کام آتا ہے جس سے چہرے کے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں۔ اس کا چھلکا خشک ایک تولہ رگڑ کر سرسوں کا تیل ملا

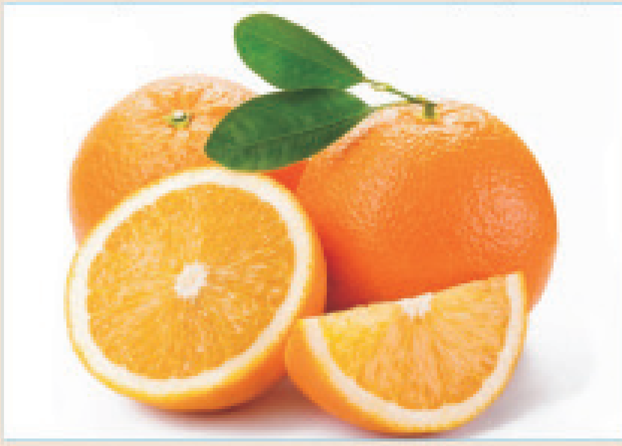

کر چہرے پر لیپ کرنے اور ایک گھنٹہ بعد دھو لینے سے چہرہ صاف ہو جاتا ہے۔ خفقان، وحشت اور متلی کو دور کرتا ہے۔ ہیضہ، ٹائیفائیڈ اور گرمی کے اسہال میں اس کا استعمال مفید ہے۔ اس کا شربت پیاس کو تسکین دیتا ہے اور قوت قلب کے لیے مفید ہے۔ سنگترہ کا رس ایک سیر میں دو سیر چینی ملا کر ہلکی آنچ پر شربت تیار کیا جاتا ہے۔ دو تولے شربت صبح و شام استعمال کرنا شدت پیاس اور قوت قلب کے لیے مفید ہے۔ اگر سنگترے کھانے سے بدہضمی ہو جائے تو فوری طور پر دو تولہ گڑ کھا لینے سے طبیعت صحیح ہو جاتی ہے۔

یہ سینے کو صاف کرتا ہے اور جوش خون کو دفع کرتا ہے۔ اس کے رس میں وٹامن سی اور کیلشیم وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جو انسانی توانائی اور نشوونما کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ وٹامن اے، بی اور ڈی بھی سنگترے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ مصفی خون ہے اور اس کے استعمال سے پھوڑے پھنسیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ثقیل خوراک کھانے کے بعد سنگترہ مفید ہے۔ اس کے چھلکوں سے تیل بھی نکالا جاتا ہے جو بطور خوشبو استعمال ہوتا ہے۔

ہلدی کی چائے کے 9 زبردست فوائد

برصغیر اور ایشیا میں عام استعمال ہونے والی ہلدی کے فوائد ہر روز سامنے آرہے ہیں اور اب کئی تحقیقات سے اسے جادوئی شے قرار دیا جاچکا ہے۔ مصدقہ معلومات اور تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ہلدی اپنے اندر انقلابی طبی خواص رکھتی ہے۔ تو پہلے ہلدی کی چائے کے فوائد پڑھئے اور اس کے بعد چائے تیار کرنے کی ترکیب جانتے ہیں۔

جوڑوں اور گٹھیا کے درد میں مفید

2017 میں کی گئی تحقیق سے معلوم ہوا کہ امریکہ میں جوڑوں اور گٹھیا کے درد سے متاثرہ افراد ہلدی کی چائے پیتے ہیں اور اس سے انہیں افاقہ ہے۔ ہلدی میں موجود کئی اہم کیمیکل ہڈیوں کے درد اور جوڑوں کی سوزش کم کرتے ہیں۔

جسم کے دفاعی نظام کی بہتری

ہلدی میں موجود سرکیومن میں اینٹی وائرل، اینٹی انفلیمٹری اور اور اینٹی آکسیڈنٹس خواص موجود ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بیکٹیریا کو ختم کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ امیاتی نظام کو درست رکھتی ہے اور کینسر سمیت کئی بیماریوں کو آپ سے دور رکھتی ہے۔

دل کے امراض کو دور رکھے

ہم جانتے ہیں کہ سرکیومن نامی کیمیکل ہلدی میں عام پایا جاتا ہے اور بہت سے خواص رکھتا ہے۔ یہ ایک جانب تو اندرونی سوزش وجلن کو کم کرتا ہے تو دوسری جانب اس میں اینٹی آکسیڈنٹس موجود ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں 2012 میں ایک سروے کیا گیا اور دل کے مریضوں کو بائی پاس سے قبل تین دن قبل اور پانچ دن بعد روزانہ چار گرام سرکیومن دیا گیا تو اس سے دل کے دورے کے خطرات 17 فیصد تک کم دیکھے گئے۔

کینسر میں مفید

اس وقت دنیا بھر میں کینسر کے درجنوں علاج دریافت ہو چکے ہیں جن کی اپنی اپنی افادیت اور خامیاں ہیں۔ سرکیومن خلیات میں گڑ بڑ اور تبدیلی کو روکتا ہے اور اس طرح کینسر کا تدارک کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان گنت مطالعات سے ثابت ہو چکا ہے کہ سرکیومن کینسر کے خلیات پھیلنے اور سرطانی رسولیوں کی افزائش روکتا ہے۔ اب تک 2000 سے زائد تحقیقی مقالے صرف سرکیومن اور سرطان پر شائع ہو چکے ہیں اور ماہرین اس کے سرطان کے خلاف تحقیق کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں تاہم اب تک کی تحقیقات بتاتی ہے کہ ہلدی کا یہ اہم عنصر کینسر کے خلاف مؤثر ہے۔

ہاضمے کو بہتر بنائے

ہلدی ہاضمے کے پورے عمل کو بہتر بنا کر معدے کے درد اور بوویل سنڈروم سے بچاتی ہے۔ 2012 میں کی گئی ایک تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہلدی کھانے کے عمل کو تیزی سے ہضم کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔

الزائیمر میں بھی مفید

اپنے زبردست خواص کی بنا پر ہلدی میں موجود سرکیومن دماغی اور اعصابی امراض سے بچاتی ہے۔ دماغ میں خلیات کی ٹوٹ پھوٹ اور ان کے انحطاط کو روکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کھانوں میں ہلدی کی مقدار کو بڑھایا جائے۔ ایک اور بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہلدی دماغ کے ان پروٹین کو تبدیل ہونے سے بچاتی ہیں جو الزائیمر اور دیگر بیماریوں کی وجہ بنتے ہیں۔

ہلدی جگر کی محافظ

سرکیومن کا جادوئی کیمیکل جگر کو مختلف بیماریوں سے بچاتا ہے۔ اس کے علاوہ پیشاب کی تھیلی کو تندرست رکھتا ہے جس سے پتھری پیدا نہیں ہوتی۔ جگر ہمارے جسم کی ایک پیچیدہ مشین ہے اور سرکیومن اس کی حفاظت کرتا ہے۔

ذیابیطس میں مفید

روایتی ادویات میں گزشتہ ہزاروں برس سے ہلدی استعمال ہو رہی ہیں جو ذیابیطس کنٹرول کرنے کے کام آتی ہیں۔ جانوروں اور انسانوں پر کیے گئے کئی مطالعات سے معلوم ہوا ہے کہ ہلدی کا اہم ترین جزو سرکیومن ذیابیطس کے خلاف مؤثر ہے۔

پھیپھڑوں کا محافظ

سرکیومن پھیپھڑوں کو صحت مند رکھتا ہے۔ 2017 کے ایک مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ اگرچہ معلومات تھوڑی ہیں لیکن سرکیومن، دمے، سانس کے امراض، سسٹک فائبروسس اور پھیپھڑوں کے دیگر امراض کے علاج میں مفید ثابت ہوا ہے۔

ہلدی کی چائے کیسے تیار کی جائے

تازہ ہلدی کا پاؤڈر لیجئے۔ اس کے علاوہ بازار سے ہلدی کی چائے کا سفوف بھی ملتا ہے جس میں سرکیومن کی زائد مقدار کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

پہلے چار کپ پانی ابال لیجئے۔ ہلدی کا پیسٹ یا پاؤڈر ایک سے دو چمچ اس میں شامل کیجئے۔ دس منٹ تک اسے پانی میں ابال لیجئے اور اسے پانچ منٹ تک ٹھنڈا ہونے دیجئے۔ اس کے علاوہ آپ دودھ، اور شہد بھی ملا سکتے ہیں۔ لیکن ماہرین کہتے ہیں کہ چائے میں کریم، گاڑھا دودھ، اور گھی ایک چمچ ملانے سے سرکیومن جسم میں اچھی طرح جذب ہو جاتی ہے۔ چائے تیار ہے اور استعمال کیجئے۔

خواتین صرف ایک منٹ دوڑ کر بھی ہڈیاں مضبوط بنا سکتی ہیں

تیس سال سے زائد عمر کی خواتین میں ہڈیوں کا بھربھراپن اور اس سے وابستہ دیگر امراض عام ہوتے ہیں لیکن اب اچھی خبر یہ ہے کہ اگر وہ روزانہ صرف ایک منٹ تک بھی پوری قوت سے دوڑیں تو اس سے ان کی ہڈیوں کی کثافت (ڈینسٹی) پر اچھا اثر ہوتا اور ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں۔

اچھی اور مضبوط ہڈیوں کا مطلب بڑھاپے میں گٹھیا سے بچاؤ اور فریکچر میں کمی ہے۔ اگر خواتین باقاعدہ ورزش اور جم جانے کا وقت نہیں نکال لیں تو ایک سروے کے مطابق وہ روزانہ 60 سے 120 سیکنڈ پوری تیزی سے دوڑ کر اپنی ہڈیوں کو مضبوط بنا سکتی ہیں۔ اگر اسی عرصے میں ہلکا وزن اٹھا کر بھی ورزش کریں تو اس سے بھی بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔

ماہرین کا اندازہ ہے کہ روزانہ 2 منٹ تک دوڑ کر ہڈیوں کو مزید 6 فیصد تک مضبوط بنایا جا سکتا ہے یعنی ہڈیوں کی کثافت اور ٹھوس پن میں 6 فیصد بہتری واقع ہوتی ہے۔ یہ سروے برطانیہ میں یونیورسٹی آف ایکسیٹر اور یونیورسٹی آف لاسٹر کے ماہرین نے کیا ہے۔

انناس کے جوس کے پانچ فوائد جن سے ہم ناواقف تھے

انناس ایک فرحت بخش پھل ہے جس کی افادیت ہر روز بڑھتی جارہی ہے۔ ماہرین کے مطابق انناس کے رس پینے کے کئی اہم فوائد سامنے آئے ہیں۔

انناس وٹامن، معدنیات، اینٹی آکسیڈنٹس اور دیگر اہم اجزا سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ان کا استعمال کئی طرح سے مفید ثابت ہوتا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اسے سوزش، جسمانی جلن اور بیماری سے بحالی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ انناس کی 100 کے قریب اقسام ہیں لیکن افادیت کی بنا پر اس کی 8 اقسام کو ہی کاشت اور فروخت کیا جاتا ہے۔

1: امنیاتی نظام کو بہتر بنائے

انناس کے رس کا بہترین مصرف یہ بھی ہے کہ اس سے جسم کا قدرتی دفاعی نظام بیدار ہوتا ہے جو بیماریوں سے لڑتا ہے۔ اسے امنیاتی نظام کہتے ہیں۔ اس ضمن میں فلپائن میں اسکول کے بچوں پر ایک تجربہ کیا گیا اور انہیں ڈبے میں بند انناس روزانہ کی بنیاد پر دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ اس سے بچے بیکٹیریا (جراثیم) سے محفوظ رہے اور بیماری کے بعد ان کی بحالی کا وقت بھی کم ہو گیا۔

2: ہاضمے کو بہتر بنائے

انناس میں ایک اہم اینزائم بروملین موجود ہوتا ہے جو پروٹین کو توڑ کر ہاضمے کے عمل کو بہتر بناتا ہے۔ اس کے علاوہ بروملین کو کیپسول کی صورت میں بھی فروخت کیا جارہا ہے جو آپریشن کے بعد سوزش، زخم اور دیگر تکالیف کو دور کرتا ہے۔

3: کینسر کا تدارک

ایک تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ انناس کا تازہ رس سرطان سے بچاتا ہے۔ اس کے گودے اور جڑ کا رس بچہ دانی اور آنتوں کے سرطان کے پھیلنے کو روکتا ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں کی گئی ایک تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ بی ٹا کیروٹین انناس کا خاص جزو ہے جو کئی طرح کے سرطان کو روک سکتا ہے جن میں پروسٹیٹ کینسر اور بڑی آنت کا سرطان سرفہرست ہیں۔

4: جلد کا محافظ

وٹامن سی اور بی ٹا کیروٹین کی موجودگی انناس کو جلد کا بہترین دوست بناتی ہے۔ اس میں موجود بہت سے اینٹی آکسیڈنٹس جلد کی ٹوٹ پھوٹ، جھریوں اور جھلسن کو روکتی ہے۔

5: آنکھوں کے لیے مفید

ہم جانتے ہیں کہ وٹامن سی کا استعمال آنکھوں میں موتیا ہونے کو کئی لحاظ سے کم کرتا ہے۔ ماہرین پہلے ہی برطانیہ کے 1000 جڑواں بچوں پر وٹامن سی اور موتیا کے تعلق پر تحقیق کر چکے ہیں۔ اس لیے یہ موتیا کو روکنے میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

انناس میں چھپے خزانے

زرعی تحقیقی مرکز امریکا کے مطابق ایک کپ یعنی 250 گرام انناس (بغیر چینی) میں 132 کیلوریز، ایک گرام پروٹین، 32 گرام کاربوہائیڈریٹس، 25 گرام چینی اور نصف گرام فائبر (ریشہ) ہوتا ہے۔ اس کا ایک کپ بڑوں کی روزانہ میگنیشیم کی 65 فیصد ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وٹامن سی کی 42 فیصد روزمرہ ضروریات کے لیے یہ کافی ہے۔ جب کہ فولیٹ، وٹامن بی 6 اور تھایامن کی 10 فیصد ضروریات پوری کرتا ہے۔

چہرے کا حسن نکھارنے کے 5 قدیم چینی ٹوٹکے

چینی خواتین اپنی بے داغ اور چمکدار جلد، ریشمی بالوں اور سلم سمارٹ جسامت کے لیے مشہور ہوتی ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں بلکہ صدیوں سے چین میں خواتین اپنی جلد اور مجموعی حسن کا اچھی طرح خیال رکھتی آئی ہیں۔ جس زمانے میں بیوٹی کریمیں، ٹونرز، سیرمز اور دبلا کرنے والی ادویات ایجاد بھی نہیں ہوئی تھیں تب بھی چینی خواتین گھریلو ٹوٹکوں اور نسخوں سے اپنی خوبصورتی اور صحت کی دیکھ بھال کرتی آ رہی ہیں۔ یہ ٹوٹکے صدیوں پرانے ہیں جن میں سے کئی نسخوں پر آج بھی عمل کیا جاتا ہے۔ ان ٹوٹکوں میں سے چند کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

1۔ چمکدار جلد

چہرے کی جلد کو چمکدار بنانے کے لیے جڑی بوٹیوں کا استعمال چین میں عام ہے۔ جوان اور خوبصورت جلد کے لیے یہ ٹوٹکے اپنا کر دیکھیں:

☆ پودینے کے پتوں کو پیس کر پیسٹ بنا لیں۔ اسے چہرے پر لگانے سے چہرے پر قدرتی چمک اور رونق آجاتی ہے۔

☆ ایک چھوٹا چمچ سندل کی لکڑی کا پاؤڈر لیں۔ اس میں ذرا سی زعفران اور دو چھوٹے چمچ کچے دودھ کے شامل کر لیں۔ منہ دھو کر اس ماسک کو چہرے پر لگائیں اور ہلکے ہاتھ سے چہرے کا مساج کریں۔ بیس منٹ بعد چہرے کو دھو لیں۔

2۔ قدرتی ٹونر

چینی عورتیں ٹونر کے طور پر چاول کے پانی کا استعمال کرتی ہیں جس سے ان کی جلد نکھر جاتی ہے۔

☆ ایک پیالے میں چاول بھگو دیں۔ اسے اچھی طرح سے چلائیں جب تک پانی دودھیا نہ ہو جائے۔

☆ اس پانی کو چھان کر فریج میں رکھ دیں اور اسے ٹونر کی طرح روئی پر لگا کر چہرے پر ملیں۔

☆ اس پانی کو تین سے چار دن تک اسٹور کیا جا سکتا ہے۔

3۔ سبز چائے کا استعمال

چین میں سبز چائے کا استعمال بے حد عام ہے۔ قدرتی جڑی بوٹیوں سے بنی سبز چائے کے استعمال سے:

☆ وزن کم رہتا ہے۔

☆ اس میں کیٹیچن، اینٹی ایجنگ اور اینٹی آکسیڈنٹ خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

☆ قوت مدافعت مضبوط ہوتی ہے جو کئی قسم کی بیماریوں سے جسم کو محفوظ رکھ کر بڑھتی عمر کے اثرات کو کم کرنے میں مدد کرتی ہے۔

4۔ جھریاں دور کرنے کے لیے

چہرے کی جھریاں اور چھائیاں دور کرنے کے لیے انڈے کی سفیدی بہت مفید ہے۔ اس میں ایک طرح کی ایسٹرینجنٹ ہوتا ہے جو جلد کو صحت مند بناتا ہے۔

☆ انڈے کی سفیدی کو چہرے پر ماسک کی طرح لگا لیں۔ بیس منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو لیں۔

5۔ کیل مہاسوں کے لیے

مونگ کی پھلیوں اور ہلدی کے ذریعے اپنی خوبصورتی پر چار چاند لگائے جا سکتے ہیں۔ کیل مہاسوں اور چہرے کی سوجن سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ نسخے اپنائیں:

☆ مونگ کی پھلی کو پیس لیں۔ اس میں دہی شامل کر کے گاڑھا سا پیسٹ بنا لیں۔ اس سے چہرے پر لگا کر ہلکے ہاتھ سے مساج کریں۔ تھوڑی دیر بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو لیں۔

☆ بادام کو ابال کر پیس لیں۔ ایک بڑے چمچ پیسٹ میں ایک چھوٹا

چمچ ہلدی اور ایک چھوٹا چمچ شہد کا شامل کریں۔ اس ماسک کو چہرے پر لگا کر بیس منٹ بعد چہرہ دھولیں۔

6 عادتیں اپنائیں خوبصورتی یقینی بنائیں

ویسے تو صحت اور خوبصورتی ہر کسی کے لئے ضروری ہے لیکن خواتین صحت اور اس سے بھی زیادہ حسن کے معاملے میں حساس ہوتی ہیں۔ اگر صحت اچھی ہو تو خوبصورتی کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔ خوبصورت رہنے کے لئے کے لئے چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

جس طرح بغیر محنت کے انسان کو کوئی بھی چیز حاصل نہیں ہوتی بالکل اسی طرح صحت اور خوبصورتی بھی آسانی سے نہیں ملتی۔ ایک دن میں کچھ نہیں ہوتا اسکے لئے آپ کو اپنی روز مرہ روٹین پر نظر ثانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوبصورتی کے لئے مندرجہ ذیل عادتیں ایسی ہیں جنھیں اپنانا ضرور ہے۔

1۔ جلد کی صفائی

جلد آپ کی صحت اور خوبصورتی کو ظاہر کرتی ہے۔ جلد کی حفاظت اور اسکی صفائی کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ جلد کی حفاظت کریں روزانہ اسکی کلینزنگ کریں اور اسے موائسچرائز رکھیں۔

2۔ وزن پر کنٹرول کریں

وزن کا آپ کی جسامت کے مطابق درست ہونا ضروری ہے۔ تندرست اور سمارٹ رہنا خوبصورتی کے اصولوں میں سے ایک ہے۔ وزن کنٹرول میں رکھنے کے لئے اپنے کھانے پینے کے روٹین پر نظر ثانی کریں۔ ایسی چیزیں کھائیں جو وزن بھی نہیں بڑھاتیں اور جلد کو خوبصورت بناتی ہیں، جیسے گاجر، چقندر، انار اور ہری سبزیاں۔

3۔ متوازن غذا کھائیں

خوبصورتی پانے کے لئے متوازن غذا کا حصول بے حد ضروری ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غذا کا غلط استعمال نہ صرف صحت بلکہ خوبصورتی کو بھی تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اگر آپ پورا مہینہ یا کم از کم ایک ہفتہ تک کوئی بھی ایسی غذا نہ کھائیں جو جلد یا صحت کے لئے نقصان دہ ہے تو آپ خود میں آنے والی تبدیلی نوٹ کر سکیں گی۔ پھل، سبزیاں، شہد، دودھ اور دہی روز اپنی خوراک کا حصہ بنائیں۔ رات میں کھانا کم سے کم اور جلدی کھائیں۔

4۔ پانی کا استعمال بڑھائیں

روزانہ کم از کم آٹھ سے دس یا بارہ گلاس پانی پینا انتہائی ضروری ہے۔ پانی زیادہ پینے سے آپ کی جلد تروتازہ رہتی ہے۔ جلد میں موجود نمی برقرار رہتی ہے۔ اگر خالی پانی نہیں پیا جائے تو اس میں لیموں یا شہد شامل کریں۔ اس سے پانی کی افادیت دوگنی ہو جاتی ہے۔

5۔ ورزش کریں

جو کوئی بھی خوبصورت جلد کا خواہاں ہے اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ ورزش و دیگر جسمانی سرگرمیوں میں حصہ لے۔ جانوروں جیسی پھرتی صرف ورزش کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جو لوگ ورزش کو اپنا معمول بنالیتے ہیں وہ صحت اور خوبصورتی کے حصول کے لیے کسی دوسری چیز کے محتاج نہیں رہتے۔

6۔ بھرپور نیند لیں

پرسکون نیند کا وقت پر آنا صحت کی علامت ہے۔ اگر آپ کو نیند نہیں آتی تو یہ یقیناً تشویش کی بات ہے۔ نیند نہ آنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں جن میں سے ایک ذہنی تناؤ بھی ہے۔ کوشش کریں کہ ان تمام باتوں سے اپنے ذہن کو آزاد رکھیں۔ پریشانیاں اور ذمہ داریاں ہر کسی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ انھیں اپنے ذہن پر سوار نہ کریں۔ مطالعہ کی عادت ڈالیں بیڈروم کو پرسکون اور تاریک رکھیں نیند خود بخود آجائے گی۔

تاثرات

گذشتہ شماروں کی طرح جنوری کا 'خواتین دنیا' بھی اپنی انفرادیت کا جھنڈا لہراتا نظر آیا۔ 'امریتا پریتم سے مجیب صدیقی کا انٹرویو' بہت ہی کارآمد اور امریتا پریتم کے فکری و شخصی گوشوں سے پردہ اٹھاتا ہوا انٹرویو ہے۔ ان کی ذہانت، متانت، سنجیدگی اور لکھنے کے تئیں خلوص کا آئینہ دار یہ انٹرویو امریتا پریتم شناسی میں ایک خاصے کی چیز ہے۔ میں اس خوبصورت اور یادگار انٹرویو کے لیے آپ کو دلی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ جہانِ نسواں کے تحت صبیحہ ناہید، ثنا اسد، زاہدہ زیدی کے مضامین کافی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں بہت اچھی معلومات ہیں، افشاں ملک، شہر بانو، شفیقہ فرحت، مہناز انور، چشمہ فاروقی کی کہانیاں بھی پسند آئیں۔ کل ملا کر مذکورہ شمارے میں جو مواد پروسا گیا ہے وہ بھی بہت اعلیٰ و معیاری ہے۔ اس کا انتخاب اور ترتیب قابل تحسین و آفرین ہے۔ میں آپ کے تمام ادارے کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ ایک مشورہ ہے 'گر قبول افتد زہے عز و شرف' کہ 'خواتین دنیا' میں ایک صفحہ ایسا بھی ہونا چاہیے جس سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مہینے بھر کی سرگرمیوں کا علم ہو سکے۔ علاوہ ازیں یہ بھی معلوم ہو سکے کہ کونسل نے مشاعروں اور سیمناروں کے علاوہ اس ماہ اور کون کون سے ترقی و بنیادی کام کیے، آگے کیا عزائم ہیں اور اردو کے فروغ میں زبان سکھانے کے کن نئے مراکز کو منظوری دی گئی وغیرہ وغیرہ۔ امید ہے کہ میرے مشورے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔

شبانہ محمد یامین، شیر سرائے محلہ، اکولہ، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے خواتین دنیا جاری کر کے آدھی آبادی پر جو احسان کیا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کتنی سرکاریں آئیں، کتنی خواتین تنظیموں نے شور مچایا، کتنی ہی بار حکومت سے مطالبے کیے گئے کہ خواتین بیداری سے متعلق ہر زبان میں ایسے لٹریچر کی ضرورت ہے جو ان میں جوش و خروش اور ہمت و جرأت پیدا کر سکے لیکن ہر بار نتائج صفر ہی رہے۔ ہم شکر گزار ہیں بھارتیہ جنتا پارٹی اور مرکزی وزیر جناب پرکاش جاوڈیکر جی کے اور بالخصوص پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کے کہ انھوں نے آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا احترام کیا۔

میں کئی ماہ سے خواتین دنیا کے شماروں کا مطالعہ کر رہی ہوں میرے خیال میں شاید یہ دنیا کا واحد ماہنامہ ہے جو عمدہ و دیدہ زیب کتابت و طباعت سے مزین ہے، کلر فل رسالہ ہے اور قیمت صرف دس روپیہ۔ یہ اپنے آپ میں حیرت انگیز ہے۔ ماہنامہ خواتین دنیا اس لیے بھی قابل تعریف ہے کہ اس میں جو مواد ہے وہ بڑا معیاری ہوتا ہے۔ اس کی ایڈیٹنگ، سیٹنگ، پرنٹنگ سب کی سب بہت اعلیٰ ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ خواتین کو بہت عمدہ قانونی معلومات بھی فراہم کرائی جاتی ہیں۔ خواجہ عبدالمنتقم صاحب کا بہت بہت شکریہ کہ انھوں نے بہت سلیس انداز میں خواتین کے قانونی حقوق کے سلسلے میں بہت ہی عرق ریزی سے مضامین ترتیب دیے ہیں۔ اس کے مستقل کالم بھی قابل تعریف ہیں حسن سخن کے تحت شاعرات کے بہت ہی اچھے اشعار کا انتخاب ہوتا ہے، باورچی خانہ میں نئی نئی ڈشیز بنانے کی تراکیب سے بہت فائدہ ہوتا ہے صحت و تندرستی اور آرائش و زیبائش کا کالم بھی بہت خوب ہے۔ خواتین خبرنامہ بھی اپنی نوعیت کا الگ کالم ہے۔ ایک گزارش ہے کہ پورے رسالے میں ادب زیادہ حاوی نظر آتا ہے۔ مزید دلچسپیاں بڑھائی جا سکتی ہیں۔ امید ہے کہ جیسے رسالے آگے کی طرف بڑھے گا، اس میں مناسب و معیاری تبدیلیاں بھی ہوتی چلی جائیں گی۔ شکریہ۔

ندا فرحین، احمد آباد، گجرات

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مغرب میں تنقید کی روایت
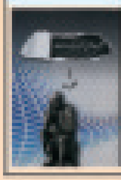
مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)
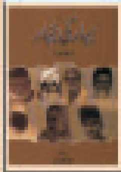
مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

بہار گلشن کشمیر (جلد اول و دوم)

مرتبہ و مولفہ: پنڈت برج کشن کول
و پنڈت جگت موہن ناتھ ریند
صفحات: 454، 537
قیمت: 275، 300 روپے

دیوندر ستیارتھی

مصنف: عبدالسمیع
صفحات: 162
قیمت: 90 روپے

رشید حسن خاں

مصنف: عبدالحمید
صفحات: 122
قیمت: 74 روپے

سید امتیاز علی تاج

مصنف: محمد شاہد حسین
صفحات: 136
قیمت: 80 روپے

علی سردار جعفری
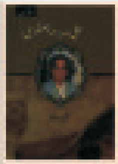
مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90 روپے

یاس یگانہ چنگیزی
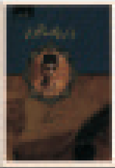
مصنف: حسن مثنی
صفحات: 149
قیمت: 90 روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد ششم)
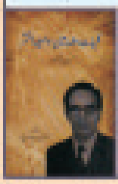
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: 115/- روپے

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)
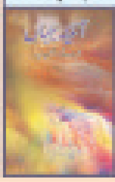
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)
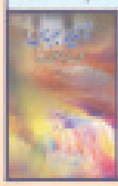
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)
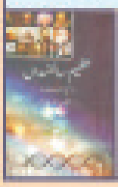
مصنف: اسرار حسین
صفحات: 121
قیمت: 32/- روپے

اسرار کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658ء)
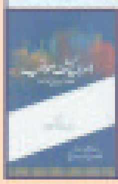
مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
و حواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: 335/- روپے

انتخاب سخن (جلد اول) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: 175/- روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر
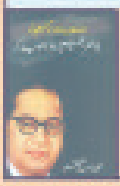
مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

داستان گو آیا ہے
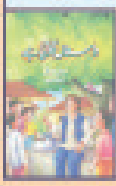
مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجر الدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم
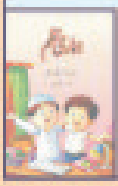
مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجر الدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly February 2018, Vol. 02, Issue: 2 RNI. No. DELURD/2017/74026
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

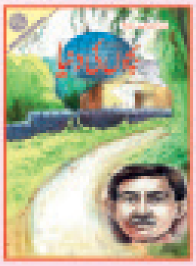

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025